بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَالْعَصْرِ o

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ o

اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

وَتَوَاصَوْ بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ o

نجات کی راہ

سُورۃُ العصر کی روشنی میں

(ڈاکٹر اسرار احمد کی ایک تحریر جو اوّلاً نومبر ۶۶ء کے ''میثاق'' میں شائع ہوئی تھی)

..................(۱)..................

سورۃُ العصر قرآنِ حکیم کی مختصر ترین سورتوں میں سے ہے اور خوش قسمتی سے اس میں جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں وہ سب کے سب اُردو میں عام طور پر مستعمل ہیں اور ایک عام اُردو دان بھی ان سے بہت حد تک مانوس ہے، یہی وجہ ہے کہ اس سورت کا سرسری مفہوم تقریباً ہر شخص فوراً جان لیتا ہے اور اس میں کسی قسم کی دِقت محسوس نہیں کرتا، لیکن اگر غور وفکر سے کام لیا جائے اور اس کے مضامین کی گہرائیوں کا بدقّتِ نظر مشاہدہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سورۃ ''سہل ممتنع'' کی کیسی عظیم الشان مثال ہے اور اس کی ظاہری سادگی اور سلاست کے پردوں میں علم وحکمت کے کتنے قیمتی خزانے پوشیدہ ہیں۔

> واقعہ یہ ہے کہ عقائد وایمانیات کے بیان میں اختصار کی انتہا کے باوصف مفہوم کی وسعت اور معانی کے عمق کے اعتبار سے جو مقام سورۂ اخلاص کا ہے، وہی مقام نجات اور فوز وفلاح کے عملی نہج اور طریق کار کے بیان میں اس سورت کو حاصل ہے۔

اسی بناء پر مولانا حمید الدّین فراہیؒ نے اس کو ''جوامع الکلم'' میں شمار کیا ہے۔اور امام شافعیؒ نے اس کے بارے میں فرمایا ہے کہ: ''اگر لوگ تنہا اسی ایک سورت پر غور کریں تو یہ ان کے لیے کافی ہو جائے۔''

یہ سورت کل تین آیات پر مشتمل ہے اور اس کی دوسری آیت عددی اعتبار ہی سے نہیں، بلکہ مفہوم کے لحاظ سے بھی مرکزی حیثیت کی حامل ہے۔اس میں یہ دردناک حقیقت بطور کلیہ بیان ہوئی ہے کہ ''انسان بالعموم اور بحیثیت مجموعی خسارے میں ہے۔'' پہلی آیت میں اس حقیقت کبریٰ کے دلائل وشواہد کو صرف ایک قسم میں سمو کر پیش کر دیا گیا ہے...... جب کہ تیسری آیت اُس کلیے سے ایک استثناء کو بیان کر رہی ہے۔اس طرح یہ سورت واضح طور پر دو حصوں میں منقسم ہوگئی ہے۔اس کا پہلا جزو یعنی وَالْعَصْرِ o اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ o ایک دعویٰ اور اس کی دلیل پر مشتمل ہونے کی بنا پر انتہائی گہری علمی اہمیت کا حامل ہے۔جب کہ دوسرا جزو یعنی اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ o عملی اعتبار سے انتہائی اہم ہے۔

> اس حصے میں ضمنی طور پر ایک کامیاب زندگی کے ناگزیر عملی لوازم کی تشریح ہوگئی ہے، اور اس طرح یہ حصہ ''صراط مستقیم'' اور ''سواء السبیل'' کی مختصر ترین لیکن جامع ومانع تفسیر بن گیا ہے۔

سطورِ ذیل میں اس سورت کی تفسیر لکھنا مقصود نہیں ہے، اس لیے کہ راقم الحروف کا مقام یہ نہیں ہے اور اس لیے بھی کہ اس کے نزدیک اس سورت کی تفسیر کا حق مولانا حمید الدین فراہیؒ نے ادا کر دیا ہے۔

پیش نظر تحریر سے مقصود صرف یہ ہے کہ سورۃ کے بعض مجموعی تاثرات اور خاص طور پر اس کے جزوِ ثانی کے بعض مضمرات کو واضح کیا جائے، تاکہ دین کے تقاضوں کا ایک مجمل مگر جامع تصور سامنے آ جائے۔

..................(۲)..................

بحیثیت مجموعی اس سورۃ پر انذار کا رنگ غالب ہے۔ تبشیر کا پہلو بھی اگرچہ موجود ہے لیکن خفی اور ضمنی طور پر۔

اوّلاً اس کی ابتداء انتہائی چونکا دینے والی ہے۔ وَالْعَصْرِ O اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ O کے الفاظ صرف اپنے مفہوم کے اعتبار ہی سے خوابِ غفلت سے بیدار کر دینے والے نہیں ہیں، بلکہ ان کے انداز اور اسلوب حتیٰ کہ ان کے صوتی اثرات تک میں جھنجھوڑنے اور چونکانے کی صلاحیت موجود ہے۔

ثانیاً یہاں اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ O بطور ایک قاعدہ کلیہ کے بیان ہوا ہے اور اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا......الآیۃ میں ایک استثناء پیش کیا گیا ہے۔

گویا انسان کا خسران ایک عالمگیر حقیقت ہے اور فلاح
وکامیابی محض ایک استثنائی صورت!

اگرچہ بعینہٖ یہی صورت حال سورۃ التین میں بھی پیش فرمائی گئی کہ: ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ. میں نوعِ انسانی کی مجموعی اور عمومی حالت بیان کی اور اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ‘‘ میں مستثنیٰ افراد کا تذکرہ کیا گیا، لیکن وہاں دو چیزوں نے انذار پر تبشیر اور بیم پر رجاء کے پہلو کو غالب کر دیا ہے۔ ایک ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ سے متصلاً قبل لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ. کی یقین دہانی میں پوشیدہ تسلی اور تشفی نے، اور دوسرے اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کے فوراً بعد فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ کی نوید جانفزا نے جو فوز وفلاح اور کامیابی وکامرانی کی مثبت ضمانت ہے۔ سورۃُ العصر میں نہ صرف یہ کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ. کی قسم کی کوئی تسلی و تشفی (Re-Assurance) موجود نہیں ہے، بلکہ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ کے مثبت وعدے کی بجائے بات صرف خسران سے نجات کے تذکرے پر ختم ہو گئی ہے۔

سورۃُ التین کے مقابلے میں سورۃُ العصر پر انذار کے رنگ کے غلبے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جب کہ سورۃ التین میں گراوٹ سے استثناء کے تذکرے میں ایمان کے ساتھ اس کے لوازم میں سے صرف عمل صالح کے ذکر پر اکتفا فرمایا گیا ہے، وہاں سورۃ العصر میں خسران سے بچاؤ کو عمل صالح کے ساتھ ساتھ ایمان کے زیادہ کٹھن اور ثقیل لوازم، یعنی تواصی بالحق اور تواصی بالصبر سے بھی مشروط کر دیا گیا ہے۔

حضرت مسیح علیہ السلام کا ایک قول سورۃُ التین اور سورۃُ العصر کے مضامین کے مابین ایک لطیف فرق کو واضح کرنے میں بہت مدد ہے۔ پہاڑی کے وعظ میں آنجنابؑ ارشاد فرماتے ہیں:

’’تنگ دروازے سے داخل ہو، کیونکہ وہ دروازہ چوڑا ہے اور وہ راستہ کشادہ ہے جو ہلاکت کو پہنچاتا ہے اور اس سے داخل ہونے والے بہت ہیں۔ کیونکہ وہ دروازہ تنگ ہے اور راستہ سکڑا ہے جو زندگی کو پہنچاتا ہے اور اس کے پانے والے تھوڑے ہیں۔‘‘ (۷:۱۳،۱۴)

اگرچہ سورۃ التین اور سورۃ العصر دونوں میں حضرت مسیحؑ کے بیان کردہ دونوں راستوں کا تذکرہ موجود ہے، لیکن سورۃ العصر کی روشنی کا اصل ارتکاز اس چوڑی اور کشادہ شاہراہ پر ہے جس پر انسانوں کا ایک عظیم ہجوم، غول در غول، صرف بطن اور فرج کی پوجا کرتے ہوئے اور محض جبلی خواہشات کی بندگی کرتے ہوئے کچھ فرسودہ روایات کے سہارے اور زیادہ تر بھیڑ چال کے انداز میں رواں دواں ہے، اور لحظہ بہ لحظہ ابدی خسران کے دردناک انجام سے قریب تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس کے برعکس سورۃ التین کا نور بنیادی

طور پر اس دوسری راہ پر مرتکز ہے جو اگرچہ تنگ ہے اور اس پر چلنے والے بہت کم ہیں، لیکن بالآخر وہ فراخی اور ابدی کامیابی و کامرانی سے ہمکنار کرنے والی ہے۔

> ایک حساس اور باشعور انسان جس کے اندر کا نور بیدار ہو چکا ہو، جب سورۃ العصر کی روشنی میں نوعِ انسانی کی عظیم اکثریت کی مایوس کن حالت اور ان کے انجام کی تلخی کا مشاہدہ کرے گا تو لازماً اس پر مایوسی اور نا اُمیدی طاری ہو گی اور عین ممکن ہے کہ وہ انسان کی فطرت اور سرشت ہی سے بدگمان ہو جائے۔
> اس ذہنی و نفسیاتی تاریکی کے عالم میں سورۃ التین امید کی ایک کرن بن کر نمودار ہوتی ہے۔ اس کی روشنی میں صراطِ مستقیم پر گامزن چند نفوسِ قدسیہ کی ایک جھلک اور انسانی فطرت و سرشت کی شرافت و کرامت کی شہادت سے یاس کی تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں اور انسان اپنے مستقبل کے بارے میں امید اور خود اپنے آپ پر ایک گونہ اعتماد محسوس کرنے لگتا ہے۔

یہاں ایک اور دلچسپ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ O کی عالمگیر حقیقت پر وَالۡعَصۡرِ کے ذریعے شہادت بھی آفاق گیر پیش فرمائی گئی، اس لیے کہ جتنی جلی وہ حقیقت ہے اسی قدر روشن اس کی دلیل ہے، لیکن لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ O کی خفی حقیقت پر شہادت میں بھی زیادہ سے زیادہ اُن چند نفوس قدسیہ کو پیش کیا جا سکا جو کبھی ''تین و زیتون'' کے جھنڈوں تلے چلتے پھرتے دیکھے گئے، یا ''طورِ سینین'' کی بلندیوں پر رب الارباب سے ہم کلام پائے گئے، یا ''البلد الامین'' میں انسانی عظمت کی شہادت دیتے ہوئے نظر آئے۔ علیھم الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ۔

..................(۳)..................

وَالۡعَصۡرِ کی چونکا دینے والی صدا ایک حساس اور باشعور انسان کے ذہن کو فوری طور پر اپنے قریبی ماحول میں گمشدگی اور ذاتی مسائل و معاملات میں سرگردانی کی حالت سے نکال کر زمان و مکان کی وسعتوں کی جانب متوجہ کر دیتی ہے۔ گویا وَالۡعَصۡرِ کا اوّلین مفاد یہ ہے کہ انسان ''آفاق میں گم''[۱] ہونے کی حالت سے نکل کر آفاق اور اس کی وسعتوں کا شعوری (Subjective) مشاہدہ کرے۔ ع

کھول آنکھ، زمین دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ!

واقعہ یہ ہے کہ انسان کی ذہنی پستی کا سب سے بڑا مظہر یہی ہے کہ وہ اپنے قریب ترین ماحول اور ذاتی حالات و واقعات میں اُلجھ کر رہ جائے۔ اس حال میں انسان کی کل کائنات بس ان ہی دو چیزوں تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔

> نہ وہ خود اپنی ہستی کی اندرونی و باطنی شہادتوں کی جانب متوجہ ہوتا ہے اور نہ خارج کی وسیع تر آفاقی آیات کی طرف التفات کرتا ہے۔

اور رفتہ رفتہ حالت یہ ہو جاتی ہے کہ اپنے چھوٹے چھوٹے مسائل اُسے پہاڑ معلوم ہونے لگتے ہیں اور حقیر سی خواہشوں اور تمناؤں کے پیچھے وہ اپنے آپ کو ہلکان کر لیتا ہے۔

> اس ذہنی و نفسیاتی جبس سے نکلنے کی دو راہیں قرآن حکیم نے بیان فرمائی ہیں۔ ایک خود ''اپنے من میں ڈوب کر'' حقیقتُ الحقائق تک رسائی کی راہ، اور دوسرے آیاتِ آفاقی پر غور و فکر اور دھر و عصر کی اظہر من الشّمس شہادتوں پر تدبر و تفکر کا راستہ۔
> سورۃ العصر اسی مؤخر الذکر راستے کی جانب رہنمائی کرتی ہے۔

عصر کی جانب ادنیٰ تامل و التفات سے فوری طور پر یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ یہ زمانہ جو انسان کو اپنی غفلت میں ٹھہرا ہوا معلوم ہوتا ہے حقیقتہً بڑی تیزی اور انتہائی سُرعت سے گزرا چلا جا رہا ہے۔ اس کی ایک دو کروٹوں ہی کی دیر ہے کہ جو کچھ آج موجود ہے وہ معدوم ہو جائے گا اور[۲] وقت کی بساط پر نئے کھلاڑی کھیل رچائیں گے۔ اس کی تیز روی اور

---

[۱] کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق (اقبالؔ)

[۲] ع ''جو تھا نہیں ہے، جو ہے نہ ہوگا، یہی ہے اک حرف محرمانہ'' (اقبالؔ)

برق رفتاری بابانگ دہل اعلان کر رہی ہے کہ اے غافل انسانو! تم، تمہارے مسائل اور تمہارے معاملات سب چشم زدن میں ختم ہو جانے والے ہیں۔ عمر کی مہلت تیزی سے ختم ہو رہی ہے اور متاعِ عزیز بڑی سرعت سے برف کی مانند پگھلی جا رہی ہے اور کچھ دیر کی بات ہے کہ تم قصۂ ماضی بن جاؤ گے۔ ع

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی!
گردوں نے گھڑی عمر کی ایک اور گھٹا دی!

پھر یہی زمانہ، جسے فلکِ پیر کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے، انسان کا سب سے بڑا واعظ و ناصح بھی ہے۔ اس کی گردشوں میں قوموں کے عروج و زوال کی داستانوں کی شکل میں عبرت اور نصیحت و موعظت کے ضخیم دفاتر محفوظ ہیں۔ اس نے سینکڑوں قوموں کو اُبھرتے قوت پکڑتے اور پھر قعرِ مذلت میں گرتے دیکھا۔ ہزاروں حکومتیں اس کے سامنے بنیں اور بگڑیں۔ بیسیوں تہذیبیں وجود میں آئیں، عروج کو پہنچیں اور پھر گل سڑ کر متعفن غلاظت کا ڈھیر بن گئیں۔ ارب ہا ارب انسان پیدا ہوئے، پلے بڑھے اور مٹی میں مل گئے۔ کتنوں نے فتح و ظفر مندی کے کھیل کھیلے اور کتنوں نے سروری اور ظلِ الٰہی کے سوانگ رچائے، لیکن بالآخر سب زمانے کی وسعتوں میں گم ہو گئے اور قُس بن ساعدہ جیسے لوگ بھی یہ کہتے رہ گئے کہ:

این الآباء والاجداد و این المریض والعوادو این الفراعنة والشدّاد واین من بنیٰ وشَیَّدو زخرف ونجّد وغرّہُ المال والولد واین من بغٰی وطغٰی و جَمَعَ فاوعٰی وقال انا ربّکم الاعلی.[1]

قرآن حکیم نے یہاں صرف وَالْعَصْرِ کے ایک لفظ میں جن تاریخی حقائق کی جانب اشارہ کیا ہے، وہ جب تفصیل سے بیان ہوئے تو علومِ قرآنی کی ایک مستقل صنف بن گئے، جسے شاہ ولی اللہؒ نے ''تذکیر بایام اللہ'' کا نام دیا۔

..................(۴)..................

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ O ایک ایسی دردناک مگر ناقابلِ انکار حقیقت کا بیان ہے، جس کے ادنیٰ مظاہر اسی دنیا میں چاروں طرف پھیلے نظر آتے ہیں، لیکن جس کی اصل تلخی موت کے بعد ظاہر ہونے والی ہے۔

غنیمت ہے کہ یہاں دِلِ دردمند اور قلب حساس شاذ ہی کسی کو عطا ہوا، ورنہ ایک نہیں لاکھوں گوتم بدھ ان شدائد و مصائب کا مشاہدہ کر کے جن سے ابنائے نوع ہر آن دوچار ہیں اپنے آرام و آسائش کو تج کر جنگل میں جا دھونی رماتے۔

ذرا آنکھیں کھول کر گردوپیش کا جائزہ لیا جائے تو نظر آتا ہے کہ کرۂ ارض پر کروڑوں انسانوں کو دن بھر کی کمر توڑ دینے والی محنت و مشقت کے باوجود پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہیں ہوتا، کتنے ہی ہیں جن کے سامنے ان کے عزیز و اقارب اور محبوب و محبّ دوا کے ایک گھونٹ کو ترستے دم توڑ دیتے ہیں۔ کتنوں کو تن ڈھانکنا نصیب نہیں ہوتا اور کتنوں کے پاس سر چھپانے کو جگہ موجود نہیں! کیسے کیسے صدمے یہ انسان برداشت کرتا ہے اور کیسے دکھ اس کی جان کے لاگو بنتے ہیں، کبھی اولاد کی محبت اسے رُلاتی ہے تو کبھی مال کی تمنا اُسے تڑپاتی ہے۔ کبھی ناکام آرزوئیں اس کے گلے کا ہار بن جاتی ہیں تو کبھی پامال شدہ جذبات اس کے لیے سوہانِ رُوح بن جاتے ہیں۔ اربابِ نعمت کی بظاہر چمکیلی اور بھڑکدار زندگی پر نہ جانا چاہیے۔ ان بے چاروں کے اپنے دُکھ ہیں عوام کے دکھوں سے کہیں زیادہ اذیت ناک اور تکلیف دہ! خوب سے خوب تر اور اعلیٰ سے اعلیٰ تر کی تلاش میں یہ دن رات مارے مارے پھرتے ہیں، اور اس دوڑ دھوپ میں جن مایوسیوں (Frustrations) کا سامنا انہیں ہوتا ہے اور متضاد خواہشات کی رسہ کشی سے جو اُلجھنیں (Conflicts) انہیں درپیش ہوتی ہیں، وہی جانتے ہیں کہ ان کی بدولت کیسے کیسے الاؤ ان کے سینوں میں گرم ہوتے ہیں اور

---

[1] ترجمہ: کہاں ہیں آباؤ اجداد، کہاں ہیں مریض اور ان کی عیادت کرنے والے؟ کہاں ہیں فراعنہ اور شداد اور وہ لوگ جنھوں نے مضبوط عمارتیں بنوائیں، جنھوں نے آراستہ کیا اور سنوارا اور مال و اولاد کی محبت نے ان کو دھوکے میں رکھا۔ کہاں ہیں وہ جنھوں نے سرکشی کی اور اکڑے اور سمیٹا اور کہا: **انا ربکم الاعلی!**

کیسے دہکتے ہوئے انگارے ان کے دل وجگر کو کباب کرتے ہیں۔ آرام وآسائش کے سارے سامان رکھتے ہوئے انہیں نہ دن کا چین نصیب ہوتا ہے نہ رات کی نیند۔ یہ سب کیا ہے **لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ**[1] کی عملی تفسیر۔ خسرانِ انسانی کی ابتدائی منزل!!...... اور انسانی المیے کا صرف پہلا مرحلہ۔

اس مرحلے میں انسان کی حالت اکثر وبیشتر صرف اتنی ہی قابل رحم ہے جتنی کولہو کے کسی بیل یا بار برداری کے کسی جانور کی۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ بزعم خویش حیوانوں کے مقابلے میں انسان جسمانی تکلیف سے بڑھ کر نفسیاتی کرب اور روحانی اذیت کو بھی محسوس کرتا ہے، لیکن اس کی ٹریجڈی کا اصل نقطۂ عروج (Climax) وہ ہوگا جب یہ مشقتیں اُٹھاتا، مصیبتیں جھیلتا، تکلیفیں برداشت کرتا اور صدمے سہتا اچانک اپنے پروردگار کے حضور میں محاسبے اور سوال وجواب کے لیے پیش کر دیا جائے گا: **یٰٓاَیُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدْحًا فَمُلٰقِیْهِ**[2] تب انسان پکار اُٹھے گا کہ کاش میں مٹی ہوتا۔ اس مرحلے کے تصور ہی سے نسل انسانی کے گل سرسبد کانپ جاتے ہیں اور حسرت سے پکار اُٹھتے ہیں: کاش میں درختوں پر چہچہاتی چڑیا ہوتا یا سوکھی گھاس کا ایک تنکا۔

اُس وقت **اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ O** کی اصل حقیقت منکشف ہوگی اور انسانوں کی عظیم اکثریت تاسف وحسرت کے ساتھ زبانِ حال سے پکارے گی کہ ؏

مرا اے کاش کہ مادر نہ زادے

ذٰلِکَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِیْنُ O

..................(۵)..................

﴿اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ O﴾

انسان کی کامیابی اور خسران مبین سے نجات کی واحد راہ کا بیان ہے، لہٰذا ناگزیر ہے کہ اس آیۂ کریمہ پر مقدور بھر غور وفکر کیا جائے اور اس کے مضمرات اور مقدرات کو حتی الامکان پوری طرح سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ O﴾ سے ناقابل انقطاع تعلق کی بناء پر اس آیت پر اوّلین تدبر آیۂ ماسبق کے پس منظر ہی میں کیا جانا چاہئے۔ یہ دونوں آیتیں فوری طور پر جس حقیقت کو واضح کرتی ہیں وہ یہ ہے کہ زندگی کی ہر وہ نہج جو ایمان، عمل صالح، تواصی بالحق وتواصی بالصبر سے خالی ہو خالص زیاں کاری ہے، چاہے بظاہر دنیا کے مروجہ معیارات کے اعتبار سے کتنی ہی شاندار کامیابیوں کی چمک دمک نگاہوں کو خیرہ کیے دیتی ہو۔ یہ آیات انسان کی کامیابی وناکامی اور نفع ونقصان کا ایک بالکل نیا معیار پیش کرتی ہیں اور ان کے انسانی ذہن وشعور میں مرتسم ہونے کا لازمی نتیجہ یہ نکلنا چاہئے کہ زندگی کی تمام اقدار بدل جائیں اور زندگی کی دوڑ دھوپ اور سعی وجدوجہد کے ماحصل کے بارے میں انسان کا نقطۂ نظر کاملۃً تبدیل ہوجائے۔

> حتیٰ کہ سیاسی قوت ہو یا معاشرتی حیثیت، مال و دولت کی فراوانی ہو یا وسائل واسباب کی ارزانی، اونچی اونچی ملازمتیں ہوں یا مستحکم کاروبار، لمبی اور چمکیلی کاریں ہوں یا وسیع وخوشنما محلات۔ یہ سب اگر ان چار چیزوں کے بغیر ہوں تو نہ صرف یہ کہ محض سراب نظر آئیں بلکہ عذاب کے مقدمات معلوم ہوں۔

واقعہ یہ ہے کہ انسان کی کامیابی اور ابدی خسران سے نجات کے لیے سب سے پہلی شرط یہی ہے کہ اس کے نقطۂ نظر میں یہ انقلاب بالفعل واقع ہوجائے اور یہ حقیقت دل و دماغ میں اس طرح پیوست ہوجائے کہ ہر چیز کی ماہیت واقعۃً بدلی ہوئی نظر آئے۔ ؏

دیدن دگر آموز، شنیدن دگر آموز!!

دوسری انتہائی اہم حقیقت جو ان دونوں آیات کے باہمی ربط وتعلق سے ظاہر ہوتی ہے یہ ہے کہ یہ چار چیزیں نجات کے ناگزیر لوازم اور فلاح انسانی کی کم از کم شرائط

---

[1] ترجمہ: ”حقیقت یہ ہے کہ ہم نے انسان کو محنت اور مشقت میں پیدا کیا ہے۔“ (سورۃ البلد:۴)

[2] ترجمہ: ”اے انسان! تو تکلیفیں اور مشقتیں اٹھاتا بالآخر اپنے رب سے جا ملے گا۔“ (سورۃ الانشقاق:۶)

ہیں۔اس لیے بھی کہ یہاں مقاماتِ بلند کا تذکرہ نہیں بلکہ خسارے اور نقصان سے نجات کی بات ہو رہی ہے، اور اس لیے بھی کہ یہ کسی شاعر کا کلام نہیں جس میں بہت کچھ کبھی محض ''زیبِ داستاں کے لیے'' اور کبھی صرف قافیے اور ردیف کی ضرورتوں کے تحت بڑھا لیا جاتا ہے، بلکہ کلامِ الٰہی ہے جس کا ایک ایک حرف اپنی جگہ علم وحکمت کا سرچشمہ اور حقائق و معارف کا گنجینہ ہے۔ یہاں جو کچھ ہے، حق ہے، اور اس میں نہ کمی کی گنجائش ہے نہ بیشی کا امکان! کامیابی کی ان چار لازمی شرائط میں سے کسی ایک کو بھی ساقط کر دیا جائے تو قرآن حکیم کا ذمہ ختم ہو جاتا ہے، اور اس کے بعد اپنے آپ کو کلامِ الٰہی کی بشارتوں کا مستحق سمجھنا خود فریبی سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

> بدقسمتی سے ہمارے دورِ انحطاط میں یہ حقیقت نگاہوں سے بالکل اوجھل ہو گئی ہے۔ ہماری ایک عظیم اکثریت محض ایمان...... اور اس کے بھی صرف قانونی پہلو پر...... نجات کی صدفی صد اُمیدوار بنی بیٹھی ہے۔ جن کو ذرا زیادہ فہم وشعور عطا ہوا ہے وہ عمل صالح کی قید لگا لیتے ہیں۔ لیکن اہل علم کی بھی ایک بڑی تعداد تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کو اعلیٰ درجات اور بلند مرتبے کی چیزیں سمجھ کر اضافی نیکیاں شمار کر بیٹھی ہے!!

کاش کہ لوگ سورۃ العصر پر تدبر کریں، اور اس حقیقت کو جان لیں کہ قرآن حکیم انسانی نجات کو ایمانِ، عمل صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر چاروں سے مشروط قرار دے رہا ہے۔

..................(۲)..................

ایک قدم آگے بڑھائیے اور توجہ کو ان چاروں الفاظ پر مرکوز کر کے ان کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ چار مختلف چیزیں یا کسی ایک نسخے کے چار علیحدہ علیحدہ اجزاء نہیں، بلکہ نجات کی راہ کے چار نشانات اور ایک ہی ''صراط مستقیم'' کے چار سنگہائے میل ہیں۔ یہ چاروں ایک جانب نجات کے لوازم ہیں اور دوسری جانب باہم دگر، لازم وملزوم!

> ایمان، عمل صالح کا پیش خیمہ ہے۔ عمل صالح، تواصی بالحق کا مقدمہ اور تواصی بالحق، تواصی بالصبر کا پیش رَو! ایمان صحیح ہوگا تو عمل صالح لازماً پیدا ہوگا۔ عمل صالح لازماً تواصی بالحق کو جنم دے گا اور...... تواصی بالحق لازماً تواصی بالصبر پر منتج ہوگا۔

ایمان کے سیاسی اور عمرانی پہلوؤں اور اس مسئلے سے متعلق فقہی و کلامی بحثوں سے قطع نظر ایمان کی اصل حقیقت اور ماہیت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایمان نفس انسانی کی ایک خاص کیفیت کا نام ہے، جو کائنات کے بنیادی حقائق، یعنی توحید، معاد اور رسالت کے علم سے پیدا ہوتی ہے اور قلب انسانی پر اس طور سے مستولی ہو جاتی ہے کہ انسان کے جذبات، خواہشات اور ارادے باہم توافق اور ہم آہنگی کے ساتھ اس علم کے تابع ہو جاتے ہیں، اور فی الجملہ علم اور ارادے کے مابین دوئی ختم ہو کر یگانگت پیدا ہو جاتی ہے۔

> علم حقیقی کے ساتھ انسانی ارادے کی مکمل یگانگت اور ہم آہنگی ہی ایمان کی اصل ہے، اور اس سے پیدا شدہ سکون اور اطمینان ایمان کا اصل ماحصل!!

رہی علم کی وہ حالت کہ: ؎

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زُہد پر طبیعت ادھر نہیں آتی

تو جب تک یہ کیفیت برقرار رہے اور نفس انسانی تضادات (Conflicts) کی آماج گاہ بنا رہے، اس وقت تک ایمانِ حقیقی سے انسان محروم رہتا ہے۔ مولانا حمید الدین فراہیؒ کے الفاظ میں:

> ''خلاصۂ بحث یہ ہے کہ ایمان ایک نفسانی و روحانی حالت کا نام ہے جو انسان کے تمام عقائد و اعمال پر حاوی ہے...... اس کے دو رکن ہیں ایک علم اور دوسرا عمل، ان میں سے ایک کو بھی

> ڈھادو گے تو اس کی پوری عمارت ڈھے جائے گی۔ ایک شخص اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور دین کے تمام اصول و فروع سے خوب واقف ہے، لیکن نافرمانی اور گناہ پر برابر مصر ہے تو اس کے لیے اس ایمان میں سے کوئی حصہ نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک معتبر ہے۔"

ظاہر ہے کہ جب ایمان کی حقیقت یہ ہے تو عمل صالح تو خود اس کی ایک فرع ہے اور اس کا ایک لازمی نتیجہ! یہاں تک کہ عمل صالح کے فقدان اور ایمان کے عملی نتائج کے عدم ظہور سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ایمان ہی میں خامی ہے اور صورتِ حال وہ ہے کہ ﴿وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ﴾[1] ورنہ ایمان و عمل صالح کا تو ایسا چولی دامن کا ساتھ ہے کہ ان کا ایک دوسرے کے بغیر تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، اور ان دونوں کو ایک شمار کرنا خلاف واقعہ نہیں ہے۔

"عمل صالح" کی قرآنی اصطلاح بھی بہت غور و فکر کی مستحق ہے۔ ایک طرف تو قرآن حکیم اس وسیع اصطلاح میں اپنی ساری قانونی و اخلاقی تعلیمات اور پوری شریعت کو سمیٹ لیتا ہے اور دوسری طرف اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اسی میں انسان کی حقیقی نشوونما اور ترقی کا راز مضمر ہے اور اسی کے ذریعے انسان کی تمام فطری صلاحیتوں اور قوتوں (Potentialities) کا صحیح رُخ پر ارتقاء ممکن ہے، مولانا فراہیؒ کے الفاظ ہیں:

> "اللہ تعالیٰ نے اعمالِ حسنہ کو "صٰلحٰت" کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، اس لفظ کے استعمال سے اس عظیم حکمت کی طرف رہنمائی ہوتی ہے کہ درحقیقت انسان کی تمام ظاہری و باطنی، دینی و دنیاوی، شخصی و اجتماعی، جسمانی و عقلی صلاح و ترقی کا ذریعہ اعمالِ حسنہ ہی ہیں، یعنی عمل صالح وہ عمل ہوا جو انسان

[1] ترجمہ: "یہ بدو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے (اے نبی!) کہہ دو تم ایمان نہیں لائے، بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں، رہا ایمان تو وہ تو ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔" (سورۃ الحجرات: ۱۴)

> کے لیے زندگی اور نشوونما کا سبب بن سکے اور جس کے ذریعے سے انسان ترقی کے اُن اعلیٰ مدارج تک پہنچ سکے جو اس کی فطرت کے اندر ودیعت ہیں...... اس نکتے کو دوسرے لفظوں میں یوں سمجھ سکتے ہیں کہ انسان کائنات کی اس مجموعی مشین کا ایک پُرزہ ہے۔ اس وجہ سے اس کے اعمال میں سے صالح اعمال صرف وہی ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی اس حکمت تدبیر کے موافق ہوں جو اس نے اس کلی نظام کے لیے پسند فرمائی ہے۔"

گویا ایمان نام ہے انسان کے خیالات و تصورات اور خواہشات و جذبات کے علم حقیقی کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کا اور عمل صالح نام ہے اعمالِ انسانی کی اس مشیت کلی کے ساتھ موافقت کا جو اس کائنات میں جاری و ساری ہے اور یہ دونوں ایک ہی حقیقت کے دو پہلو اور ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ مجید ہمیشہ ایمان اور عمل صالح کا تذکرہ ایک ساتھ کرتا ہے اور ایسے مقامات اوّل تو ہیں ہی بہت کم جہاں صرف ایمان کا ذکر کیا گیا ہو اور جہاں ایسا ہوا ہے وہاں بھی اکثر و بیشتر کوئی قرینہ ایسا ضرور موجود ہوتا ہے جس سے ایمان کے عملی تقاضوں کی جانب از خود اشارہ ہو جائے۔

مزید غور فرمائیے کہ انسان ایک متمدن حیوان ہے اور کوئی چاہے یا نہ چاہے اپنے اردگرد کے ماحول سے اس کا فعل و انفعال اور تاثیر و تاثر کا تعلق بالفعل موجود ہے۔ اوّلاً خود اس کے اعمال اگر واقعی صالح ہوں تو ان کے صالح اثرات اس کے خارج پر لازماً مرتب ہوں گے اور بالکل اس طرح جس طرح ایک دہکتے ہوئے انگارے سے گرمی خارج ہوتی ہے اور اپنے ماحول کو گرما دیتی ہے اور برف کی خنکی اپنے ماحول میں نفوذ کرتی ہے، انسانی اعمال کا صلاح و فساد ماحول کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ثانیاً ماحول میں اگر فساد موجود ہو تو لازماً ایک صالح انسان کو اس کے مفسد اثرات سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے مدافعت کرنی ہوگی...... ان ہی دو چیزوں کی بنیاد پر ایمان اور عمل صالح سے لازماً تواصی بالحق اور

تواصی بالصبر پیدا ہوتے ہیں اور بالکل جیسے ایمان اور عمل صالح کا چولی دامن کا ساتھ ہے، اسی طرح تواصی بالحق اور تواصی بالصبر بھی باہم دگر لازم وملزوم ہیں۔

مولانا فراہیؒ عمل صالح سے تواصی کے تعلق کی وضاحت اس طرح فرماتے ہیں:

> ''اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح ایمان سے عمل صالح پیدا ہوا اسی طرح عمل صالح سے تواصی وجود میں آیا، کیونکہ جس شخص کی نگاہوں میں حق محبوب ہو جائے گا اور وہ اس کے لیے صبر واستقامت کی تمام کڑیاں بھی سہنے پر آمادہ ہوگا، اس کے بارے میں لازماً اس کا علم، اس کی محبت اور اس کی غیرت ہر چیز بڑھ جائے گی اور اب صرف اسی قدر نہیں چاہے گا کہ خود ہی اس سے محبت کرے، بلکہ یہ بھی چاہے گا کہ تمام دنیا اس سے عشق کرے اور جہاں کہیں بھی حق کو مظلوم ومقہور اور باطل کو غالب وفتح مند دیکھے گا تڑپ اُٹھے گا اور ایک غیور اور شریف انسان کی طرح دوسروں کو بھی اُبھارے گا کہ حق کی حمایت کے لیے آمادہ ہوں اور اس کا یہ دوسروں کو ابھارنا بھی درحقیقت خود اس کے اپنے ہی جذبۂ حمایت کا ایک قدرتی نتیجہ ہے اور اس کا ایک حصہ ہے۔ پس یہاں تواصی کا ذکر اللہ تعالیٰ نے عمل صالح کے ایک جزو اور اس کی توضیح کی حیثیت سے فرمایا ہے۔''

حق کے لغوی مفہوم کی وضاحت مولانا فراہیؒ کے الفاظ میں یہ ہے:

> ''حق اصل میں تو موجود اور قائم کو کہتے ہیں لیکن استعمال کے لحاظ سے اس کے معانی مختلف ہو گئے ہیں، کم از کم تین معنوں میں اس کا استعمال عام ہے:
>
> ۱) وہ بات جس کا واقع ہونا قطعی ہو۔
>
> ۲) وہ بات جو عقل کے نزدیک مسلم ہو۔
>
> ۳) وہ بات جو اخلاقاً فرض ہو۔

گویا تواصی بالحق چھوٹے چھوٹے اخلاقی فرائض کی ادائیگی کی تلقین سے لے کر عقل کے جملہ مسلمات اور کائنات کے جملہ حقائق کی تبلیغ واشاعت، حتیٰ کہ اس ''دین الحق'' کی شہادت اور اقامت تک پر حاوی ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا۔ مولانا فراحیؒ کے الفاظ میں:

> ''اس سے معاملے کی اصل حقیقت سامنے آتی ہے کہ مسلمانوں کو اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ عمل صالح کریں، پھر ادائے حقوق کے معاملے میں ایک دوسرے کی مدد کریں اور چونکہ ادائے حقوق بغیر خلافت وسیاست کے ناممکن ہے اس لیے ضروری ہے کہ خلافت قائم کریں۔''

اب صرف ایک مرحلہ اور باقی ہے، یعنی یہ کہ تواصی بالحق لازماً تواصی بالصبر کو مستلزم ہے۔ صبر اوّل تو خود حق پر قائم رہنے کے لیے لازمی ہے اس لیے کہ حق پر خود قائم رہنا بغیر اس کے ممکن نہیں کہ طرح طرح کے لالچ (Temptations) اور نفس کے مرغوبات کی کشش کے مقابلے میں انسان اپنے آپ کو تھام کر رکھے اور قسم ہا قسم کے نقصانات اور موانع ومشکلات کے مقابلے کے لیے تیار رہے، لیکن تواصی بالحق کے مقام پر آنے کے بعد تو صبر وضبط اور ثبات واستقامت کے عظیم امتحانات سے گزرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔

> عام مشاہدے کی بات ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی سچائی کا اقرار و اعلان بھی بسا اوقات صبر وضبط کے عظیم امتحان کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور ادنیٰ سے ادنیٰ حقیقت پر استقامت بسا اوقات ہاتھ میں دہکتے ہوئے انگارے پکڑنے کے مترادف ہو جاتی ہے، تو خود ہی تصور کیجئے کہ عقل کے جملہ مسلمات اور کائنات کے عظیم حقائق کی تبلیغ و اشاعت کیسے کچھ صبر واستقامت کی متقاضی ہوگی۔

اس پر مستزاد یہ کہ ادائے حقوق کا مطالبہ کیا جائے! اور عدل وانصاف کے قیام کی دعوت دی جائے۔ آپ کسی کو کسی چھوٹے سے چھوٹے اخلاقی فرض کی ادائیگی کی تلقین کر کے دیکھیے کہ کیسے چہروں کے رنگ متغیر ہوتے ہیں اور تیوریاں بل کھا جاتی ہیں۔ کسی کو کسی کا غصب شدہ حق واپس کرنے کو کہہ کر دیکھیے کہ کیسی ناگواری (Resentment) کا سامنا آپ کو کرنا پڑتا ہے۔ کسی مظلوم کی حمایت میں ایک جملہ منہ سے نکال کر دیکھیے کہ کیسے آپ خود بخود ظالم کے حریف اور مدمقابل بن جاتے ہیں۔ تو خود ہی غور فرمائیے کہ:

"تمام اخلاقی فرائض کی ادائیگی کی تلقین، نظامِ عدل وقسط
کے قیام کی دعوت اور پورے "دین حق" کی اقامت کا
مطالبہ ٹھنڈے پیٹوں کیسے برداشت کیا جاسکتا ہے۔"

یہ بات کہ حق کی دعوت دی جائے اور باطل اس کے مزاحم نہ ہو، میزان عدل وقسط کو قائم کرنے کا مطالبہ ہو لیکن ظالم اور غاصب خاموش رہیں، صرف ایک صورت ہی میں ممکن ہے اور وہ یہ کہ داعیانِ حق درپردہ باطل کے ساتھ مفاہمت و مصالحت (Compromise) کیے ہوئے ہوں اور پورے حق کے بجائے اس کے صرف ان اجزاء کی تبلیغ میں مصروف ہوں جو وقت کے جباروں اور قہاروں کو "بے ضرر" معلوم ہو۔ ورنہ تواصی بالحق کے تو ہر مرحلے میں ابتلا ناگزیر ہے اور اس کوچے میں ہر قدم ایک نئی آزمائش اور ہر لحظہ ایک نیا امتحان لے کر آتا ہے:

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا!

اس مرحلے پر اہل حق کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہتا کہ اپنے اپنے حوصلوں اور قوتوں کا تمام اثاثہ، اور صلاحیتوں اور توانائیوں کی تمام پونجی ایک جگہ مجتمع کر دیں اور ایک دوسرے کے دست و بازو بن کر، خود صبر کرتے اور دوسروں کو صبر واستقامت کی تلقین کرتے ہوئے، یعنی ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا﴾[1]

[1] ترجمہ: "اے ایمان والو صبر کرو، مقابلے میں ثابت قدم رہو اور چوکس وکمربستہ رہو" (آل عمران: ۲۰۰)

کی مجسم تفسیر بن کر بنیانِ مرصوص کی شکل اختیار کر لیں۔ اس منزل پر افراد کے قدم جمنے محال ہیں اور اجتماعیت ایک ناگزیر ضرورت کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حق اور صبر کی وصیت کو یہاں تفاعل کے صیغے میں بیان کیا گیا، اور ﴿وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾ میں ایک جماعتی زندگی کی اہمیت کی جانب لطیف اشارہ فرمادیا گیا۔ مولانا فراہیؒ کی تفسیر سورۃ العصر سے جو اقتباس اُوپر درج کیا گیا، اس میں آپ آگے فرماتے ہیں:

"......اور خلافت کا قیام چونکہ اطاعت امیر پر منحصر ہے اس
لیے ضروری ہے کہ ان کے اندر اطاعت بھی موجود ہو۔"

..................(۷)..................

اُوپر کی تشریحات سے یہ حقیقت دو اور دو چار کی طرح واضح ہو گئی ہے کہ ایمان، عمل صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر چار مختلف چیزیں نہیں ہیں، بلکہ ایک دوسرے کا منطقی نتیجہ اور ایک سیدھی شاہراہ کی چار منزلیں ہیں۔ ان کے آپس کے ربط وتعلق کی دوسری مثال یہ ہے کہ ایمان دراصل ایک بیج کے مانند ہے، جس سے عمل صالح کا پودا پھوٹتا ہے اور جب یہ پودا اپنی پختگی کو پہنچتا ہے تو تواصی کے برگ و بار لاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ قرآن مجید اکثر و بیشتر ایمان کے ساتھ اس کے اوّلین نتیجے یعنی عمل صالح کا تذکرہ لازماً کرتا ہے، لیکن کہیں ایسا بھی ہوا ہے کہ صرف ایمان کے تذکرے سے ان چاروں کو مراد لے لیا گیا ہے جیسے ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا﴾[1] (الآیۃ) میں جہاں ایمان کے بھی صرف اصل الاصول یعنی ربوبیت خداوندی کے اقرار کا تذکرہ فرمایا گیا اور (ثُمَّ اسْتَقَامُوْا) میں عمل صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر سب کو سمیٹ لیا گیا اور کہیں ایمان کے بعد عمل صالح کے ذکر کے بغیر تواصی کا تذکرہ فرمادیا گیا، جیسے سورۃ البلد میں ﴿ثُمَّ کَانَ مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ کے فوراً بعد فرمایا گیا کہ ﴿وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِO﴾

واقعہ یہ ہے کہ قرآنِ حکیم صلاح وفلاح کے جس راستے کی جانب رہنمائی کرتا ہے یہ چار چیزیں اس کے لیے بمنزلۂ اساس کے ہیں اور ان ہی کی تشریح اور ان کے مدارج

[1] ترجمہ: "جن لوگوں نے کہا ہمارا پروردگار اللہ ہے اور پھر اس پر جم گئے......الخ (حٰم السجدہ: ۳۰)

ومراتب کی تفصیل قرآن کے صفحات میں جابجا پھیلی ہوئی ہے۔

پھر جس طرح ایمان کے ابتدائی مراحل سے لے کر صدیقیت کے مقام تک بے شمار مدارج ہیں اور عمل صالح موٹے موٹے اعمال سے شروع ہو کر ایک گھنے اور پاٹ دار درخت کی طرح انسانی زندگی کے جملہ اطراف حتیٰ کہ اس کے بعید ترین گوشوں (Remote Corners) تک پر محیط ہو جاتا ہے، اسی طرح تواصی بالحق کے بھی مختلف مدارج اور مراتب ہیں۔ اس کی ابتدائی اور اوّلین صورت تواصی بالمرحمۃ کی ہے، جس کے مواقع ہر انسان کو ہر وقت ملتے ہیں اور جس کی صلاحیت سے بھی شاذ ہی کوئی انسان محروم رکھا گیا ہے۔[1] اس سے بلند تر مرتبے میں تواصی بالحق، دعوت الی اللہ، اور ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' کی صورت اختیار کرتا ہے اور اس سے بھی آگے بڑھ کر یہی تواصی بالحق کا شجرہ طیبہ شہادتِ حق، اعلائے کلمۃ اللہ اور اقامت دین کی سعی و جہد کے برگ و بار لاتا ہے، جن کا ''ذروۂ سنام'' جہاد فی سبیل اللہ ہے! صبر ان تمام مراحل میں انسان کا سب سے بڑا سہارا ہے اور تواصی بالحق کے اعلیٰ مدارج میں تو اس کو ایک اجتماعیت میں سمو کر تواصی بالصبر کی شکل دینے کے سوا کوئی چارۂ کار رہتا ہی نہیں۔

ایمان، عمل صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کے ان تمام مدارج تک ہر انسان کا پہنچنا یقیناً محال ہے۔

> لیکن اگر کسی انسان کی شخصیت کو کوئی اخلاقی یا روحانی بیماری گھن کی طرح کھا نہ چکی ہو تو لازم ہے کہ ایمان کا تخم جب اس کی کشت قلب میں جم کر پھوٹے تو اس سے عمل صالح اور تواصی بالحق کی متناسب اور متوازن شاخیں نمودار ہوں۔

ایک معمولی سمجھ بوجھ کا آدمی جو ایمانیات کے بھی مبادی تک ہی رسائی رکھتا ہو اور شریعت کے موٹے موٹے احکام پر عمل پیرا ہو، اگر صرف تواصی بالمرحمۃ ہی تک پہنچ پائے تو یقیناً کوئی غلط بات نہیں، لیکن اگر صورت یہ ہو جائے کہ ایمانِ بالغیب کو ایمان شہودی بنانے کے لیے تو ریاضتوں اور مجاہدوں پر ایڑی چوٹی کا زور صرف ہو رہا ہو، اور عبادات میں نوافل کی کثرت کے ساتھ مستحبات تک کا اہتمام باریک بینی اور چھان پھٹک کے ساتھ ہو رہا ہو، لیکن تواصی بالحق تو سرے سے ہی نہ ہو، یا ہو بھی تو محض وعظ و نصیحت کی حد تک، تو یہ یقیناً ایک غلط صورت حال ہے۔ اور مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے شخص کی خبر دے کر، جس کی طاعت و عبادت کا یہ حال تھا کہ فرشتوں نے خدا کے حضور اس کے بارے میں گواہی دی کہ ﴿اِنَّـہٗ لَمْ یَعْصِکَ طرفۃَ عینٍ﴾ (اس نے تو پلک جھپکنے جتنا وقت بھی کبھی تیری نافرمانی اور معصیت میں بسر نہیں کیا۔) لیکن جس کے اس جرم عظیم نے کہ فَاِنَّ وَجْھَـہٗ لَـمْ یَتَـمَـعَّرْ فِیَّ سَاعَۃً قَـطُّ (رواہ البیہقی) (یعنی اللہ کے معاملے میں اس کی بے غیرتی اور بے حمیتی کا یہ عالم رہا کہ اس کے حدود کو پامال ہوتے دیکھ کر کبھی اس کے چہرے کا رنگ شدت غیرت سے متغیر نہ ہوا) اس کو عذابِ الٰہی کا اوّلین مستحق بنا دیا۔ اس معاملے کی ایک انتہائی (Extreme) صورت ہمارے سامنے رکھ دی ہے۔

پھر اسی طرح یہ صورت حال بھی یقیناً غلط ہی نہیں انتہائی مہلک ہے کہ تواصی بالحق کے تو بلند ترین درجات پر فائز ہونے کی سعی کی جائے اور بزعم خویش اعلائے کلمۃ اللہ، اقامت دینِ الٰہی اور قیامِ نظامِ اسلامی کی جدوجہد کی جائے، لیکن عبادات میں محض فرائض کی ادائیگی ہو اور وہ بھی مارے باندھے سے، اور ایمان کے باب میں صرف چند کلامی نظریات پر اکتفا کر لی جائے۔

ان دو انتہائی صورتوں (Extremes) کے درمیان اور بھی جتنی غیر متوازن صورتیں پائی جائیں سب کی سب غلط ہیں اور مہلک امراض کی علامات!

> سورۃ العصر انسان کے لیے نجات کی جس واحد راہ کی نشاندہی کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ہر انسان اپنی اپنی صلاحیت اور وسعت و ہمت کے مطابق ایمان کی گہرائیوں تک رسائی کی کوشش کرے اور جتنا جتنا اس کی حلاوت اور چاشنی سے حصہ حاصل

[1] یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ کا ذکر ہمیشہ انسان کی اخلاقی پستی کی انتہائی علامت (Symbol) کے طور پر کرتا ہے۔

کرتا جائے، اُسی قدر عمل صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر
پر عمل پیرا ہوتا چلا جائے۔

رہا یہ مسئلہ کہ مختلف انسانوں کی صلاحیت اور وسعت کا تعین کس طرح ہو تو اگرچہ اکثر لوگوں کو شیطان نے دین میں ان کی بے عملی کے لیے یہی عذر سمجھا رکھا ہے کہ ہمارے اندر صلاحیت اور قابلیت موجود نہیں، لیکن اس کا سیدھا سا پیمانہ جو ہر شخص کے ساتھ ہر دم موجود ہے، یہ ہے کہ دنیا میں اس کی صلاحیت اور قابلیت کا ظہور کس درجے میں ہو رہا ہے۔ ایک ایسا بائس و مسکین شخص جس کی ہمت دنیا کی دوڑ میں بھی جواب دے چکی ہو، اگر دین میں عذر پیش کرے تو یقیناً اس کا عذر قابل قبول ہے۔ لیکن ایسے لوگ جو دنیا کے سارے کاروبار میں دن دُگنی رات چوگنی ترقی کر رہے ہوں، اگر دین کے معاملے میں عدم صلاحیت اور فقدانِ قابلیت کے عذر پیش کریں تو ظاہر ہے کہ ان کا یہ عذر کسی درجے میں بھی لائق اعتناء نہیں۔ بَلِ الْإِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ○ وَلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ○ (القیامۃ: ۱۴، ۱۵)

راہِ نجات

سورۃ العصر کی روشنی میں

ایک تقریر

جو ۱۵/ فروری ۷۳ء کو ایچی سن کالج لاہور کے پرنسپل صاحب کی دعوت پر کالج کے اساتذہ اور سنیئر طلبہ کے ایک اجتماع میں پرنسپل صاحب کی زیر صدارت کی گئی۔

............از............

ڈاکٹر اسرار احمد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خطبۂ مسنونہ، تلاوت سورۃ العصر اور دعا کے بعد:

محترم پرنسپل صاحب، اساتذہ کرام اور عزیز طلبہ!

سب سے پہلے میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں جس نے اپنے فضل و کرم سے ایسی سبیل پیدا فرما دی کہ آج پاکستان کی اس بلند پایۂ درس گاہ میں مطالعہ قرآن حکیم کی ہفت روزہ نشست کا آغاز ہو رہا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ اگرچہ ظاہری اسباب و وسائل کا بالکل انکار تو نہیں کیا جا سکتا لیکن اصلاً سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی کی حکمت و تدبیر سے ہوتا ہے۔ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰۤی اَمۡرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ.

اس کے بعد میں پرنسپل صاحب کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے مجھے یہاں حاضر ہو کر اظہارِ خیال کا موقع عنایت فرمایا اور اساتذہ اور طلبہ میں سے بھی ان حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اس اجتماع کے اہتمام میں حصہ لیا ہے۔

جہاں تک مطالعۂ قرآن حکیم کی اہمیت کا تعلق ہے اس کے بارے میں آج میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ ان شاء اللہ العزیز اس کے مواقع بعد میں ملتے ہی رہیں گے، بلکہ خدا نے چاہا تو ایک نشست خاص اس موضوع کے لیے وقف ہو گی۔

آج کے لیے میں نے طے کیا ہے کہ سورۃ العصر کا مختصر مفہوم آپ کے سامنے بیان کروں۔ اس انتخاب کے بہت سے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی ہے کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کے ہاں دینیات کے نصاب میں ایک سلسلۂ کتب شامل ہے جس کا نام ہے "The Right Path"، چونکہ سورۃ العصر کا بنیادی مضمون بھی یہی ہے، لہٰذا میں نے سوچا کہ مطالعہ قرآنِ حکیم کے سلسلے کا آغاز اسی سورۂ مبارکہ سے کیا جائے۔

سورۃ العصر کے بارے میں چار بنیادی باتیں

سب سے پہلے اس سورۂ مبارکہ کے بارے میں چار بنیادی باتیں ذہن نشین کر لیجئے:

۱) ایک یہ کہ ترتیب نزولی کے اعتبار سے یہ قرآن حکیم کی اوّلین سورتوں میں سے ہے۔گویا کہ یہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر مکی دور کے بالکل آغاز میں نازل ہوئی۔

۲) دوسرے یہ کہ یہ قرآن مجید کی مختصر ترین سورتوں میں سے ہے۔اس لیے کہ یہ کل تین آیات پر مشتمل ہے اور ان میں سے بھی پہلی آیت صرف ایک لفظ پر مشتمل ہے، یعنی ''والعصر''۔

۳) تیسرے یہ کہ اپنے مضمون اور مفہوم و معنی کے اعتبار سے یہ قرآن حکیم کی جامع ترین سورت ہے، اس لیے کہ قرآن مجید کتاب ہدایت ہے (هُدًى لِلنَّاسِ)، یعنی انسان کو کامیابی اور فوز و فلاح کا راستہ دکھانے کے لیے نازل کیا گیا ہے، تا کہ انسان نجات (Salvation) کو حاصل کر سکے اور واقعہ یہ ہے کہ قرآن حکیم نجات کی جس راہ کی جانب لوگوں کی رہنمائی کرتا ہے وہ نہایت اِختصار لیکن حد درجہ جامعیت کے ساتھ اس چھوٹی سی سورت میں بیان ہوگئی ہے۔اس اعتبار سے مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے پورا قرآن مجید ایک درخت کی مانند ہے اور یہ چھوٹی سی سورت اُس کا بیج ہے اور جس طرح ایک بیج میں پورا درخت پنہاں ہوتا ہے، اسی طرح سورۃ العصر میں پورا قرآنِ حکیم موجود ہے۔

یہی وجہ ہے کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب اُن میں سے دو حضرات کی ملاقات ہوتی تھی تو وہ جدا ہونے سے قبل ایک دوسرے کو سورۃ العصر ضرور سنایا کرتے تھے۔اور یہی سبب ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سورۂ مبارکہ کے بارے میں فرمایا ہے کہ اگر لوگ صرف اس ایک سورت پر غور کریں تو یہ اُن کی ہدایت کے لیے کافی ہے، بلکہ ان کا یہ قول بھی نقل کیا گیا ہے کہ قرآن مجید میں اس سورت کے سوا اور کچھ نازل نہ ہوتا تو یہی ایک سورت لوگوں کی ہدایت کے لیے کافی ہوتی۔

۴) چوتھے یہ کہ اس سورت کے الفاظ بہت سادہ اور آسان ہیں۔آپ کو معلوم ہے کہ ہر زبان میں اس کے ادب کے شاہکار وہ اَدب پارے قرار دیئے جاتے ہیں جن میں مضامین اور معانی تو بہت اعلیٰ اور بلند پایہ ہوں لیکن الفاظ نہایت آسان اور عام فہم ہوں۔ایسے ہی ادب پاروں کو ''سہل ممتنع'' قرار دیا جاتا ہے۔تو واقعہ یہ ہے کہ اوّل تو پورا قرآن مجید ہی عربی زبان کا اعلیٰ ترین ادبی شاہکار ہے اور کُل کا کُل ہی سہل ممتنع ہے، لیکن اس میں بھی خاص طور پر یہ سورۂ مبارکہ تو سہل ممتنع کی اعلیٰ ترین مثال ہے جس میں مضامین کے اعتبار سے تو گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہے، لیکن ثقیل اور بھاری بھرکم لفظ ایک بھی استعمال نہیں ہوا۔

یہاں تک کہ ایک عام اُردو دان شخص کے لیے بھی اس میں کوئی لفظ نہ نامانوس ہے نہ مشکل۔مثلاً اس کا پہلا لفظ ''والعصر'' ہے اور عصر کا لفظ ہماری عام بول چال میں استعمال ہوتا ہے، جیسے عصر حاضر، ہمعصر لوگ وغیرہ۔اسی طرح انسان کا لفظ تو گویا ہی ہے اُردو کا۔پھر خُسر کو دیکھیے تو خسارہ، خسران وغیرہ الفاظ کا ہم عام استعمال کرتے ہیں۔اسی طرح ایمان، عمل صالح، حق اور صبر بھی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کہ ہماری ہی زبان کے الفاظ ہوں۔بعض حروف جیسے اِنَّ لَفِيْ اور اِلَّا کے علاوہ صرف ایک لفظ یعنی تَوَاصَوْ ذرا نامانوس ہے، لیکن اس کا بھی مصدر یعنی وصیت ہماری بول چال میں بکثرت استعمال ہوتا ہے۔

فہمِ قرآن کے دو درجے

اس سورۂ مبارکہ کا مفہوم بیان کرنے سے قبل میں چاہتا ہوں کہ ایک بنیادی بات آپ کو بتا دوں اور وہ یہ کہ فہمِ قرآن کے بہت سے مراتب ہیں، جن میں سے اوّلین یہ ہے کہ قرآنِ مجید کی کسی سورت یا آیت میں جو اصل سبق (Lesson) پنہاں ہو اسے اخذ کر لیا جائے اور اس سے بنیادی رہنمائی (Basic Guidance) حاصل کر لی جائے۔اسے خود قرآن مجید نے تذکّر بالقرآن کا نام دیا ہے اور اس اعتبار سے قرآن مجید نہایت آسان کتاب ہے۔اس کے برعکس قرآن مجید پر غور و فکر کی بلند ترین سطح وہ ہے جسے قرآن مجید نے تدبر قرآن قرار دیا ہے، یعنی یہ کہ ہر ہر لفظ کی گہرائی میں اُتر کر اس کے معانی پر غور کیا جائے

اورقرآن کے فلسفہ وحکمت کواخذ کیا جائے۔اس پہلو سے قرآن حکیم مشکل ترین کتاب ہے اوراس کے معانی کی تہ تک پہنچنا آسان کام نہیں ہے۔

آج کی اس مجلس میں میں سورۃ العصر کا مفہوم مقدم الذکر اعتبار سے قدرے تفصیل سے بیان کروں گا، تاکہ اس سورۂ مبارکہ کی بنیادی تعلیم اوراس کی اصل رہنمائی پوری طرح واضح ہوجائے، اور پھر کچھ مختصراشارات مؤخرالذکر طریق پر بھی کروں گا، تاکہ سوچنے سمجھنے والوں کو مزید غوروفکر کے لیے رہنمائی حاصل ہوجائے۔

..................(۲)..................

ترجمہ

اس سورۂ مبارکہ کا سادہ ترین الفاظ میں ترجمہ یہ ہے:

''زمانے کی قسم ہے کہ تمام انسان خسارے میں ہیں۔سوائے
اُن کے جو ایمان لائے اورانہوں نے اچھے عمل کیے اور باہم
ایک دوسرے کوحق کی تاکید کی اور باہم ایک دوسرے کوصبر کی
تاکید کی۔''

عبارت کا تجزیہ(Analysis)

ذرا غور کیجئے تو صاف نظر آجائے گا کہ اگرچہ اس سورۂ مبارکہ میں آیات تین ہیں، لیکن ان تینوں سے مکمل جملہ ایک ہی بنتا ہے۔پہلی آیت ایک قَسم پر مشتمل ہے۔ دوسری میں ایک قاعدۂ کلیہ (General Rule) بیان ہوا ہے۔اور تیسری میں اس قاعدۂ کلیہ سے ایک استثناء (Exception) کا بیان ہے، اور تینوں آیتیں مل کر ایک سادہ سی بات (Simple statement) کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔

اب میں چاہتا ہوں کہ آپ اِس سادہ سے فقرے کو اچھی طرح ذہن نشین کر کے ذرا سے غوروفکر اور سوچ بچار سے چار نتائج اخذ کریں، جو گویا کہ اس سورۂ مبارکہ کا اصل حاصل اور بنیادی سبق (Lesson) ہیں۔

کامیابی اور ناکامی کا معیار

سب سے نمایاں اور سب سے اہم حقیقت جو بالکل ظاہر و باہر ہے اور گویا اس جامِ حقیقت نما سے خود بخود چھلکی پڑ رہی ہے یہ ہے کہ اس سورت میں انسان کی اصل کامیابی اور ناکامی اوراس کے حقیقی نفع ونقصان کا معیار پیش کیا گیا ہے۔

اِس حقیقت کو آپ سب اچھی طرح محسوس کرسکتے ہیں کہ ہر انسان اپنے سامنے کامیابی اور ناکامی اورنفع ونقصان کا کوئی نہ کوئی معیار ضرور رکھتا ہے، اوراس کی ساری عملی جدوجہد اور دنیا کی زندگی میں اس کی تمام محنت ومشقت کا رُخ اِس معیار ہی سے متعین ہوتا ہے۔ جو لوگ عقلی اعتبار سے بلوغ اور پختگی کو پہنچ چکے ہیں ان میں سے تو شاذ ہی کوئی ہوگا جس کا کوئی نہ کوئی متعین نصب العین (Goal) اور مطمحِ نظر (Ideal) نہ ہو، عموماً چھوٹے بچوں خصوصاً ان میں سے جو زیادہ ذہین ہوتے ہیں ان کے سامنے بھی کوئی نہ کوئی معیارِ مطلوب ضرور ہوتا ہے، جس کے حصول کے لیے وہ اپنی محنت اور جدوجہد کو مرتکز (Concentrate) کر دیتے ہیں۔

ہم اگر ذرا دِقّتِ نظر سے اپنے گردوپیش کا جائزہ لیں، بلکہ خود اپنے دل ودماغ میں جھانک کر دیکھیں تو صاف نظر آجائے گا کہ اس دَور میں کامیابی اور ناکامی کا اصل معیار یا تو روپیہ پیسہ، مال و دولت اور زمین و جائیداد ہے یا حیثیت، وجاہت، اقتدار اور دنیوی دبدبہ وجاہ وجلال اور عزت وشہرت اور نام ونمود، چنانچہ اِلّا ماشاء اللہ سب لوگ ان ہی چیزوں کی طلب میں لگے ہوئے ہیں اوران ہی کے لیے انہوں نے اپنی ساری سعی وجہد اور محنت اور مشقت کو صَرف کر دیا ہے۔ اکثر طلبہ کے ذہنوں میں بھی یا تو کسی ایسے فن کی تحصیل ہے جس سے خوب دولت کمائی جاسکے یا پھر کسی حیثیت و وجاہت والی پوزیشن کا حصول ہے، اوران چیزوں کو حاصل کر لینا ہی ان کے نزدیک کامیابی ہے اور حاصل نہ کرسکنا ناکامی۔

سورۃ العصر سے جو عظیم حقیقت سامنے آتی ہے وہ اِس کے بالکل برعکس ہے۔ یعنی یہ کہ انسان کی کامیابی کا معیار نہ روپیہ پیسہ ہے، نہ حیثیت و وجاہت، نہ جاہ وجلال ہے،

نہ نام ونمود، بلکہ اس کی پہلی شرط ہے ایمان، دوسری شرط ہے عمل صالح، تیسری شرط ہے تواصی بالحق اور چوتھی شرط ہے تواصی بالصبر۔ گویا ہر وہ انسان جس میں یہ چار چیزیں موجود نہ ہوں ایک ناکام، نامراد اور خائب وخاسر انسان ہے، چاہے وہ لکھ پتی ہی نہیں کروڑ پتی ہو بلکہ قارون کی سی دولت اسے حاصل ہو جائے اور چاہے کتنا ہی صاحب حیثیت و وجاہت کیوں نہ ہو اور فرعون ونمرود کی سی بادشاہی ہی کیوں نہ حاصل کر لے۔ اور اس کے برعکس (Conversely) ہر وہ شخص کامیاب اور بامراد اور فائز المرام ہے جس میں یہ چاروں چیزیں موجود ہوں، چاہے اس کے پاس مال و دولت دنیوی سرے سے موجود نہ ہو، بلکہ اسے فاقوں سے سابقہ ہو، اور چاہے وہ جائیداد اور متاع و اسباب دنیوی سے کتنا ہی تہی دست کیوں نہ ہو، یہاں تک کہ اس کے پاس سر چھپانے تک کو جگہ نہ ہو، اور چاہے وہ دنیا میں کتنا ہی غیر معروف اور گمنام کیوں نہ ہو، یہاں تک کہ کوئی اسے پوچھتا تک نہ ہو۔

غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس حقیقت کو سرسری طور پر مان لینا جس قدر آسان ہے، اس پر دل کا ٹھک جانا اسی قدر مشکل ہے۔ یہ دنیا عالم اسباب ہے اور ہم اس کے ظواہر سے لازماً متأثر ہوتے ہیں۔ اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں آرام وآسائش اور عزت و شہرت روپے پیسے اور اسباب و وسائل ہی سے وابستہ ہے تو ہم بے اختیار ان چیزوں کے حصول کے لیے کوشاں ہو جاتے ہیں، حتیٰ کہ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط، کیا جائز ہے اور کیا ناجائز اور کیا حلال ہے اور کیا حرام۔ گویا اس دنیا کی زندگی میں ہمارے رویے اور طرزِ عمل کی درستی کا تمام تر انحصار اسی بات پر ہے کہ ہمارا کامیابی اور ناکامی اور نفع و نقصان کا معیار بدل جائے۔ چنانچہ یہی اس سورۂ مبارکہ کا اصل سبق (Lesson) ہے۔

آپ غور کریں گے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اگر وہ سادہ سی حقیقت جو اس عظیم سورت میں بیان ہوئی ہے ہمارے ذہن نشین ہو جائے، اور وہ سادہ سا جملہ جس پر یہ سورت مشتمل ہے ہماری لوحِ قلب پر کندہ ہو جائے، تو ہمارے نقطۂ نظر میں کیسا عظیم انقلاب برپا ہو جائے گا، ہماری اقدار (Values) کتنی بدل جائیں گی اور عملی زندگی میں ہمارا رویہ (Attitude) کس قدر تبدیل ہو جائے گا۔ جو چیز پہلے اہم ترین نظر آتی تھی اب انتہائی حقیر نظر آئے گی، اور جو پہلے بالکل غیر وقیع نظر آتی تھی اب انتہائی اہم محسوس ہوگی۔

واقعہ یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی زندگی میں جو عظیم انقلاب برپا ہوا اِس کی تہ میں نقطۂ نظر کی یہی تبدیلی کارفرما تھی، اور نقطۂ نظر کی اِسی تبدیلی کا کرشمہ تھا کہ انہیں خدا اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا جوئی کے مقابلے میں دنیا و مافیہا بالکل حقیر نظر آتے تھے، حتیٰ کہ انہیں زندگی کی نسبت موت زیادہ عزیز ہوگئی تھی۔

الغرض، اس سورۂ مبارکہ کا اصل سبق یہی ہے، اور ہم میں سے ہر شخص کو چاہیے کہ اس کا خوب مراقبہ کرے اور اسے اچھی طرح ذہن نشین بھی کرے اور جاگزینِ قلب بھی۔

نجات کی کم از کم شرائط اور اس کے ناگزیر لوازم

دوسرا بنیادی نتیجہ جو اس جملے کی ترکیب (Construction) سے خود بخود حاصل ہوتا ہے یہ ہے کہ اس سورت میں نجات کی کم از کم شرائط بیان ہو رہی ہیں اور اس کے ناگزیر لوازم کا ذکر ہے، نہ کہ کامیابی کی بلند ترین منازل یا فوز وفلاح کے اعلیٰ مراتب کا۔ گویا یہ نجات (Salvation) کے کم از کم (Minimum) تقاضوں کا بیان ہے اور ان سے کم پر نجات کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ سادہ لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہاں کامیابی کی فرسٹ یا سیکنڈ ڈویژن کا تذکرہ نہیں ہے، بلکہ صرف آخر درجہ میں پاس ہونے کی شرح (Mere Pass Percentage) کا بیان ہو رہا ہے۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دوسرا نتیجہ بھی عملی اعتبار سے نہایت اہم ہے اور اسی کو فراموش کر دینے کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں میں شدید اخلاقی و عملی انحطاط پیدا ہوا۔ اس لیے کہ فطری طور انسان میں محنت ومشقت اور ایثار وقربانی کا مادہ کامیابی کے کم از کم معیار کی نسبت اور تناسب ہی سے پیدا ہوتا ہے اور ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جو خصوصاً دینی معاملات میں اعلیٰ مراتب اور بلند مقامات کے لیے کوشاں ہوں۔ اس کے برعکس عظیم اکثریت ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جو کسی نہ کسی طرح ہمت کر کے نجات کے کم از کم لوازم کو پورا کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس سورۂ مبارکہ میں نجات کے کم از کم تقاضوں

کو نہایت سادہ الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے، تاکہ لوگ اپنی اپنی ہمت اور وسعت کے مطابق ان کو پورا کرنے پر کمربستہ ہو سکیں۔

چاروں شرطیں لازمی ہیں

تیسرا نتیجہ جو اسی دوسرے نتیجہ کی فرع (Corollary) ہے یہ ہے کہ نجات کے لیے ایمان، عملِ صالح، تواصی بالحق، تواصی بالصبر چاروں لازم ہیں اور ان میں سے کسی ایک کو بھی ساقط نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ یہ کلامِ الٰہی ہے، اس میں کوئی حرف بھی ضرورت سے زائد اور محض ردیف و قافیہ کی ضرورت کے تحت یا غیر ضروری مبالغہ آمیزی کے لیے نہیں ہے۔ اور جب یہاں خسارے اور ناکامی سے نجات کی شرائط کے ضمن میں چار چیزوں کا بیان ہوا ہے تو یقیناً وہ چاروں ہی چیزیں لازمی ہیں اور ان میں سے کسی ایک کو بھی ساقط کر دیا جائے تو انسان کی نجات کی ذمہ داری قرآن حکیم پر نہیں رہے گی۔ بالکل ایسے ہی جیسے اگر کوئی ماہر معالج کسی مریض کو چار ادویات پر مشتمل نسخہ لکھ کر دے اور مریض اپنی مرضی سے اس میں سے کسی ایک دوا کو کم کر دے تو اب اس نسخہ کی ذمہ داری اس معالج پر نہیں ہو گی، بلکہ خود اُس مریض پر ہو گی۔

اس حقیقت پر زور دینا اِس لیے ضروری ہے کہ ہم مسلمانوں کی عظیم اکثریت کے ذہنوں میں یہ غلط بات بیٹھ گئی ہے کہ ہر کلمہ گو کی نجات لازمی ہے، گویا نجات کے لیے صرف ایمان اور اس کا بھی محض زبانی اقرار کافی ہے۔ اس کے بعد اگر کوئی کچھ بھی عمل کر لے تو یہ اضافی نیکی ہے اور اس سے اس کے درجات بلند ہو جائیں گے، ورنہ محض نجات کے لیے عمل ضروری نہیں ہے۔ بہت کم تعداد ایسے لوگوں کی آپ کو ملے گی جو ایمان کے ساتھ تھوڑے بہت عمل کو بھی کسی درجے میں نجات کے لیے ضروری سمجھتے ہوں۔ یہ تھوڑی تعداد بھی تواصی بالحق اور حق کی دعوت و اشاعت کو تو ہرگز ہر شخص کے لیے لازم نہیں سمجھتی اور یہ خیال بالکل یقینی سا گردانا جاتا ہے کہ حق کی تبلیغ و تلقین تو بس ایک مخصوص گروہ ہی کا کام ہے، باقی لوگوں کے لیے نہ صرف یہ کہ دعوت و تبلیغ لازمی نہیں ہے بلکہ مناسب بھی نہیں۔ پھر اس خاص گروہ نے بھی بالعموم کامل اور مکمل حق کی تبلیغ سے ابتلاء و آزمائش کو دعوت دینے کی عزیمت کی راہ کو چھوڑ کر زیادہ تر رخصتوں پر اپنے عمل کا دارومدار رکھ دیا ہے، اور اس طرح پوری اُمت پر بےعملی، جمود، تعطل اور عمل سے گریز اور فرار کی ذہنیت کا تسلط ہو گیا ہے۔ اور اس صورت حال میں کوئی تبدیلی اُس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک لوگوں کو یہ معلوم نہ ہو کہ نجات کے لیے عمل صالح بھی ناگزیر ہے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر حق کا اقرار و اعلان اور اس کی دعوت و شہادت بھی لازمی ہے، اور اس راہ میں جو مصیبت یا تکلیف آئے اس پر ثابت قدم رہنا بھی۔ چنانچہ یہی وہ عظیم حقیقت ہے جو اس انتہائی مختصر مگر نہایت جامع سورت میں بیان ہوئی ہے۔

ان چاروں چیزوں کے مابین جو عقلی اور منطقی ربط ہے اسے بھی سمجھ لینا ضروری ہے۔ کسی انسان کا صاحب سیرت و کردار قرار پانا اس پر منحصر ہے کہ وہ ہر معاملہ میں اوّلاً یہ دیکھے کہ صحیح بات کیا ہے۔ پھر جس بات کی صحت پر اس کے دل و دماغ گواہی دے دیں اس کو عملاً اختیار کرے اور نہ صرف خود اختیار کرے بلکہ اس کا اقرار و اعتراف اور اعلان عام بھی کرے اور دوسرے لوگوں کو بھی اس کو ماننے اور قبول کرنے کی دعوت دے، اور پھر اگر اس راہ میں کوئی دِقت پیش آئے یا ایثار و قربانی اور سرفروشی و جانفشانی کا مرحلہ آ جائے تو پامردی و استقلال کا ثبوت دے اور پیٹھ دکھا کر بھاگ نہ جائے۔ کسی شریف اور صاحب کردار انسان کے لیے ان مراحل میں سے کسی میں بھی کوئی دوسری روش اختیار کرنا ممکن نہیں۔ بصورت دیگر وہ ایک بودا، تھڑدلا اور کمزور سیرت و کردار کا حامل انسان قرار پائے گا، نہ کہ ایک شریف اور صاحب کردار انسان۔ چنانچہ یہی عقلی ربط اور منطقی ترتیب (Logical Sequence) ہے ایمان، عملِ صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر میں......اور کسی بھی صاحب کردار انسان کے لیے ان میں سے کسی ایک سے بھی کنی کترانا ممکن نہیں۔

زورِ کلام اور انتہائی تاکید و توثیق

چوتھا اور آخری نتیجہ جو اس مختصر سی سورت کی عبارت کے تجزیے سے حاصل ہوتا ہے، یہ ہے کہ متذکرہ بالا تینوں نتائج سرسری نہیں بلکہ انتہائی مؤکد اور مؤثق ہیں اور اس میں

ہرگز کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں، اس لیے کہ اوّل تو ہمارا ایمان ہے کہ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے اور اللہ کی فرمائی ہوئی بات اپنی صداقت اور حقانیت پر خود آپ ہی دلیل کامل ہے: ﴿وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا﴾ (اور اپنے قول میں خدا سے زیادہ سچا اور کون ہوسکتا ہے؟) لیکن اس پر اکتفا نہیں بلکہ خود خدا نے بھی ان حقائق پر قسم کھائی ہے اور اس طرح یہ کلام انتہائی مؤکد ہو گیا ہے، اور اس میں جو حقائق مضمر ہیں اور انسان کے لیے جو سبق پنہاں ہیں وہ سب انتہائی یقینی اور ہر قسم کے شکوک وشبہات سے منزہ اور مبرا ہیں۔ یعنی یہ کہ یقیناً نوعِ انسانی بحیثیت مجموعی گھاٹے اور خسارے سے دو چار ہونے والی ہے اور ہلاکت وتباہی کا نوالہ بننے والی ہے، سوائے ان افرادِ نوع انسانی کے جو ایمان، عمل صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر چاروں لوازم کو پورا کریں اور نجات کی اس کسوٹی پر بحیثیت مجموعی پورے اتریں۔

الغرض یہ ہیں وہ چار بنیادی نتائج جو اِس سورۂ مبارکہ پر بحیثیت مجموعی ادنیٰ تأمل اور سرسری غور وفکر سے حاصل ہوتے ہیں۔ گویا یہ ہے تذکر کی سطح پر سورۃ العصر کا اصل ماحصل!

..................(۳)..................

اب میں چاہتا ہوں کہ آپ حضرات اس سورۂ مبارکہ کے ایک ایک لفظ کو قدرے گہرائی میں اُتر کر سمجھنے کی کوشش کریں، اور بطورِ خود دیکھیں کہ اس سورۂ عظیمہ کی ظاہری سلاست کے پردوں میں کیسے کیسے عظیم حقائق مضمر ہیں اور کیسی کیسی اعلیٰ حکمتیں اور دانائیاں پنہاں ہیں اور اس طرح غالبؔ مرحوم کے اس شعر سے بھی لطف اندوز ہوں کہ

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے!
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

اور اس کے اس مصرے کو بھی داد دیں کہ:

زیر ہر ہر لفظ غالبؔ چیدہ ام میخانۂ

اس لیے کہ غالب نے اپنے کلام کے بارے میں تو یہ باتیں بس شاعرانہ تعلّی ہی میں کہہ دی ہیں، لیکن قرآنِ حکیم واقعتہً ان کا مصداقِ کامل ہے۔

''والعصر'' کا حقیقی مفہوم

سب سے پہلے لفظ ''والعصر'' کو لیجیے جس کا سادہ سا ترجمہ ہم ''زمانے کی قسم'' کر آئے ہیں۔

''عصر'' کا اصل مفہوم صرف زمانہ نہیں، بلکہ تیزی سے گزرنے والا زمانہ ہے۔ عربی میں عصر اور دہر کے دو الفاظ بہت جامع ہیں اور ان دونوں میں صرف زمان (Time) نہیں، بلکہ زمان اور مکان کے مرکب (Time & Space Complex) کی جانب اشارہ ہے اور حسن اتفاق سے قرآن مجید میں ''العصر'' اور ''الدہر'' دونوں ہی ناموں کی سورتیں موجود ہیں۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ دہر میں مرکب زمان ومکان کی وسعت کا لحاظ ہے یا جدید فلسفے کی اصطلاح میں یوں کہہ لیں کہ زمانِ مطلق (Absolute Time Or Pure Duration) مراد ہے، جب کہ لفظِ عصر میں زمانہ کا مرور اور اس کی تیز روی کی جانب اشارہ ہے۔ گویا فلسفیانہ اصطلاح میں زمانِ جاری یا زمانِ مسلسل (Serial Time) مراد ہے۔

''والعصر'' میں حرفِ واؤ حرفِ جار ہے اور اس کا مفاد قسم کا ہوتا ہے اور قسم سے اصل مراد شہادت اور گواہی ہے۔

گویا لفظ ''والعصر'' کا حقیقی مفہوم یہ ہوا کہ ''تیزی سے گزرنے والا زمانہ شاہد ہے اور گواہی دے رہا ہے۔''

خُسران کا وسیع مفہوم

اسی طرح دوسری آیت کا سادہ ترجمہ بھی ہم نے یہ کیا ہے کہ پوری نوعِ انسانی گھاٹے اور خسارے میں ہے، لیکن اس سے بھی اصل مفہوم ادا نہیں ہوتا، اس لیے کہ خسران قرآنی اصطلاح میں صرف دو چار ہزار یا دو چار لاکھ کے گھاٹے کو نہیں، بلکہ کامل تباہی اور بربادی کو کہتے ہیں۔ چنانچہ کامیابی اور بامرادی کے لیے تو قرآنِ حکیم میں متعدد الفاظ استعمال ہوئے ہیں جیسے فوز وفلاح اور رشد وسعادت، لیکن ان سب کی کامل ضد

(Antonym) کی حیثیت سے ایک ہی جامع لفظ استعمال ہوتا ہے اور وہ ہے خسران ۔ گویا دوسری آیت کا اصل مفہوم یہ ہوا کہ ''پوری نوعِ انسانی تباہی اور ہلاکت و بربادی سے دوچار ہونے والی ہے۔''

اس عظیم آیت میں جو اہم حقیقت بیان ہوئی ہے اور نوعِ انسانی کے جس المیے (Human Tragedy) کی طرف یہ آیت اشارہ کر رہی ہے اس کا صحیح مفہوم وادراک دو مرتبوں (Stages) میں ہوسکتا ہے۔ ایک یہ کہ ہر انسان اِس دنیا کی زندگی میں شدید قسم کی محنت ومشقت سے دوچار ہے۔ اکثر لوگوں کو اپنی اور اپنے لواحقین (Dependents) کی بنیادی ضرورتیں فراہم کرنے کے لیے صبح سے شام تک کمر توڑ دینے والی مشقت کرنی پڑتی ہے اور پھر بھی بنیادی ضرورتیں (Basic Necessities) تک پوری نہیں ہوتیں۔ چنانچہ انسانی آزادی کی ایک عظیم اکثریت غذا، لباس، مکان، تعلیم اور علاج معالجہ جیسی بنیادی چیزوں تک سے مناسب حد تک بہرہ اندوز نہیں ہے۔ جو لوگ نسبتاً خوشحال ہیں، انہیں بھی بہرحال محنت اور مشقت کیے بغیر کوئی چارہ نہیں۔

اس حد تک تو پھر بھی انسان زیادہ سے زیادہ ایک باربرداری کے جانور سے مشابہہ ہے، لیکن اس کا مزید المیہ یہ ہے کہ اس میں احساسات بھی بے پناہ موجود ہیں، لہٰذا اسے ان مشقتوں پر مستزاد بے شمار قسم کے صدمات سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے۔ کبھی اولاد کی محبت اُسے رُلاتی ہے تو کبھی اعزہ واقارب کے دُکھ اُسے بانٹنے پڑتے ہیں، کبھی یہ کسی عزیز کی بیماری کا غم سہہ رہا ہوتا ہے تو کبھی کسی محبّ یا محبوب کی موت کا صدمہ برداشت کرتا ہے۔ الغرض اس کے لیے صرف محنت ومشقت ہی ضروری نہیں بلکہ رنج والم بھی لازمی ہیں۔ بقول غالب ؎

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

آپ کو یقیناً معلوم ہوگا کہ حیات انسانی میں اسی درد اور دُکھ اور رنج والم کے مشاہدے سے مہاتما گوتم بدھ اس درجہ دل برداشتہ ہوگئے تھے کہ انہوں نے عین جوانی کے عالم میں نوجوان بیوی اور معصوم بیٹے کو سوتے چھوڑ کر جنگل میں جادھونی رمائی تھی۔

خوشحال اور دولت مند لوگوں کے بارے میں عوام کو اکثر یہ مغالطہ لاحق ہو جاتا ہے کہ شاید انہیں کوئی دکھ نہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جس نوع کے نفسیاتی کرب (Psychic Agony) سے ان کی اکثریت دوچار ہوتی ہے اس کا اندازہ بھی عام آدمی نہیں کر سکتا۔ چنانچہ انہیں بے شمار قسم کے تضادات ذہنی (Conflicts) اور مایوسیوں (Frustrations) کا سامنا رہتا ہے اور اکثر وبیشتر امراضِ دماغی (Mental Diseases & Psychic Disorders) کا شکار اسی طبقے کے لوگ ہوتے ہیں۔

یہ دراصل انسانی المیے کا پہلا درجہ ہے اور اِسی کا ذکر قرآن حکیم کے تیسویں پارے میں سورۃ البلد کی اس آیت میں نہایت فصاحت وبلاغت سے ہوا ہے کہ:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ﴾

''ہم نے انسان کو مشقت ہی میں پیدا کیا ہے۔''

اس پر مستزاد یہ ہے کہ اس کا المیہ دنیا کی زندگی ہی میں ختم نہیں ہوتا، بلکہ موت کے بعد اس کا اصل اور سخت تر مرحلہ شروع ہوتا ہے، گویا بقولِ شاعر ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

انسانی ٹریجڈی یعنی المیے کا نقطۂ عروج (Climax) یہ ہے کہ دنیا کی ساری محنتیں اور مشقتیں جھیل کر اور ساری کلفتیں سہہ کر اچانک اسے اپنے خالق ومالک کے سامنے محاسبے کے لیے بھی پیش ہونا پڑے گا، جہاں اسے اپنی زندگی بھر کے اعمال وافعال کی جواب دہی کرنی ہوگی۔ یہی نقشہ ہے جو قرآن کریم کی اس آیۂ کریمہ میں کھینچا گیا ہے۔

﴿یٰۤاَیُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدْحًا فَمُلٰقِیْهِ﴾

الانشقاق: ۶

''اے انسان! تجھے مشقتیں سہتے، کھپتے کھپاتے بہرحال اپنے رب کی خدمت میں حاضر ہونا ہے۔''

اور پھر اگر اس محاسبے میں اس کے خیالات و اعتقادات اور افعال و اعمال میں کجی کا پہلو غالب نکلا تو اُسے ہمیشہ ہمیش کے لیے دردناک سزا اور اذیت بخش عذاب کے حوالے کردیا جائے گا، اور یہی اصل خسران ہے۔ (ذٰلِکَ ھُوَ الۡخُسۡرَانُ الۡمُبِیۡنُ ۝ الحج:۱۱) اور مختصراً یہ ہے ﴿اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ﴾ کا حقیقی مفہوم۔

پہلی دو آیتوں کا باہمی ربط

یہ تو واضح ہے کہ پہلی آیت ایک قسم پر مشتمل ہے اور دوسری جواب قسم پر، یعنی دوسری آیت میں ایک حقیقت کا بیان ہے اور پہلی میں اِس پر زمانے کی گواہی کی جانب اشارہ ہے، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان دونوں کے مابین منطقی ربط کیا ہے؟

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عصر یعنی زمانِ جاری یا زمانِ مسلسل ایک ایسی چادر کی مانند ہے جو ازل سے ابد تک تنی ہوئی ہے۔ گویا زمانہ انسان کی تخلیق اوّلین سے لے کر نہ صرف انسان کی حیاتِ دنیوی اور اس کی پوری تاریخ بلکہ حیاتِ اُخروی اور اس کے جملہ مراحل کا چشم دید گواہ ہے۔ چنانچہ انسان کی محنت و مشقت اور رنج و الم سے بھرپور زندگی بھی اس کی نگاہوں کے سامنے ہے اور قوموں کے عروج و زوال کے تمام واقعات کا بھی وہ چشم دید گواہ ہے اور حیاتِ اُخروی میں انسانی ٹریجڈی کا نقطۂ عروج بھی گویا اس کے بالکل سامنے موجود ہے۔ اس طرح ﴿اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ﴾ کا سب سے بڑا شاہد گویا زمانہ ہی ہے۔

اس حقیقت ثابتہ پر ایک تنبیہ اور انذار کا مزید رنگ ہے جو لفظ **والعصر** کے استعمال سے پیدا ہو گیا ہے اور وہ یہ کہ انسان کی ہلاکت اور تباہی اور خسرانِ حقیقی کا اصل سبب یہ ہے کہ اس پر غفلت طاری ہو جاتی ہے اور وہ اپنے ماحول اور اپنے فوری مسائل و معاملات میں اُلجھ کر گویا گمشدگی کی سی کیفیت سے دوچار ہو جاتا ہے۔ بقولِ علامہ اقبال مرحوم ؎

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مؤمن کی یہ پہچان کہ گم اُس میں ہیں آفاق!

وَالۡعَصۡر کا لفظ انسان کو جھنجھوڑ کر غفلت سے بیدار کرتا ہے کہ غافل انسان! تیرا اصل سرمایہ وہ وقت ہے جو تیزی سے گذرا جا رہا ہے اور تیری اصل پونجی یہ مہلت عمر ہے جو سُرعت سے ختم ہو رہی ہے، اور اگر تو نے اِس میں اپنی شخصیت کی تعمیر نہ کر لی یا بقول علامہ اقبال اپنی خودی کو بلند نہ کر لیا تو پھر ابدی ہلاکت اور تباہی سے دوچار ہونا پڑے گا۔ گویا بقول شاعر ؎

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی
گردوں نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹا دی

ایمان کا اصل مفہوم

اس خسرانِ عظیم اور تباہی اور بربادی سے نجات کی شرطِ اوّل ایمان ہے۔ ایمان کا لفظ اَمن سے بنا ہے اور اس کے لفظی معنی ہیں کسی کو امن دینا اور سکون بخشنا۔ لیکن اصطلاحی معنی میں ''ل'' یا ''ب'' کے صلوں (Prepositions) کے ساتھ استعمال ہوتا ہے، جیسے اٰمَنَ لَهٗ یا اٰمَنَ بِهٖ اور اِس صورت میں اس کے لفظی معنی تصدیق اور یقین و اعتماد کے بن جاتے ہیں۔

ایمان کی اصل حقیقت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے آپ اس حقیقت پر غور کریں کہ ہر وہ انسان جو عقل اور شعور کی پختگی کو پہنچ جائے لازماً یہ سوچتا ہے کہ میں کون ہوں اور کہاں سے آیا ہوں اور کائنات کیا ہے اور اس کی ابتداء اور انتہا کیا ہے اور خود میرے سفر زندگی کی آخری منزل کون سی ہے؟؟ جن لوگوں نے فلسفہ کا کچھ بھی مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ پوری انسانی تاریخ کے دوران میں تمام سوچنے اور سمجھنے والے لوگ ان ہی سوالات پر غور و فکر کرتے رہے ہیں اور ان ہی کا اطمینان بخش جواب حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ اس لیے کہ اس کے بغیر انسان بالکل اندھیرے میں ہے کہ نہ وہ اپنی حقیقت سے آگاہ ہے، نہ کائنات کی حقیقت پر مطلع اور نہ اپنے آغاز و انجام کی خبر اسے حاصل ہے نہ کائنات کی ابتداء و انتہا کا علم، گویا بقول شاعر: ؎

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو یہ بھی کیا معلوم

اب ظاہر ہے ان سوالات کا حتمی اور یقینی جواب ہم اپنے حواس سے ہرگز معلوم نہیں کر سکتے۔ ہم ابھی اس عالم طبیعی (Physical World) کی وسعتوں کے بارے میں بھی کوئی اندازہ نہیں کر پائے، کجا یہ کہ اس کی ابتداء اور انتہا کا علم ہمیں حاصل ہو۔ اسی طرح اس سوال کا جواب بھی کہ آیا اس دنیا میں پیدائش سے قبل بھی ہماری کوئی حقیقت تھی یا نہیں اور موت کے بعد بھی ہمارا کوئی وجود برقرار رہے گا یا نہیں، حواس کے ذریعے ممکن نہیں، اس لیے کہ ہم اپنے حواس کے ذریعے نہ پیدائش سے پہلے کی دنیا میں جھانک سکتے ہیں اور نہ موت کے بعد کے عالم میں! غرض علم حقیقی کے بارے میں انسان کی مجبوری اور بے بسی کا یہ عالم ہے۔

اس پس منظر میں غور کیجئے کہ تاریخ انسانی کے دوران مسلسل بہت سے ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے جنہوں نے لوگوں کو بتایا کہ ہمارے پاس ایک خاص ذریعہ علم (وحی) ہے، جس کی بنا پر ہم حتمی اور یقینی طور پر جانتے ہیں کہ یہ کائنات نہ ہمیشہ سے تھی، نہ ہمیشہ رہے گی'' بلکہ اسے ایک خالق نے پیدا کیا ہے جو تمام صفات کمال سے بدرجہ تمام وکمال متصف ہے اور اپنی ذات وصفات میں تنہا و یکتا ہے اور ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اِسی نے تمہیں پیدا کیا اور تمہاری زندگی بس یہی دنیا کی زندگی نہیں، بلکہ وہ تمہیں مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرے گا اور وہ تمہاری اصل اور دائمی زندگی ہوگی، اور اُس زندگی میں تمہارے ساتھ معاملہ اور سلوک اِس زندگی کے خیالات وعقائد اور افعال واعمال کی بنیاد پر ہوگا۔ اور اُسی خالق و مالک نے ہمیں اس پر مامور کیا ہے کہ ہم تمہیں ان حقائق سے بھی آگاہ کر دیں اور اس دنیا میں زندگی بسر کرنے کا صحیح طریقہ بھی بتا دیں تاکہ تم اُس اُخروی زندگی میں خسران سے بچ سکو اور فوز وفلاح اور کامیابی وکامرانی سے ہمکنار ہوسکو۔

آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ ان حضرات ہی کو ہم انبیاء اور رسل کے نام سے جانتے ہیں اور ان ہی کی تصدیق کا نام ایمان ہے، جس کے دو پہلو ہیں۔ ایک زبانی اقرار اور دوسرے قلبی یقین۔ یعنی زبان سے یہ گواہی دینا کہ ہم رُسولوں کی بھی تصدیق کرتے ہیں اور ان کی تعلیمات کے مطابق خدا کو بھی مانتے ہیں اور اس کی جملہ صفات کو بھی اور بعث بعد الموت، حشر ونشر، حساب کتاب اور جزا وسزا کو بھی تسلیم کرتے ہیں اور جنت اور دوزخ کو بھی، اور دل میں اِن تمام باتوں پر پختہ یقین رکھنا ایمان ہے۔

اب ظاہر ہے کہ ایمان، کائنات اور انسان کے بارے میں علم کا حقیقی نام ہے اور اس کے دو نتیجے لازمی ہیں:

ایک یہ کہ انسان کا اضطراب رفع ہو جائے اور اسے سکون اور اطمینان حاصل ہو جائے، اور کائنات اور خود اپنی حقیقت کا علم حاصل کرنے کی جو پیاس اس کی فطرت میں تھی اسے تسکین حاصل ہو جائے۔ چنانچہ یہ داخلی امن ہی ایمان کا اصل حاصل ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ اصطلاح ''امن'' کے مادے سے اخذ کی گئی ہے۔

دُوسرے یہ کہ چونکہ بقول سقراط ''علم نیکی ہے اور جہالت بدی'' لہٰذا اِس علم حقیقی کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ عمل بھی دُرست ہو جائے اور انسان بہترین اخلاق سے مزین ہو جائے اور گھٹیا اعمال وافعال کا خاتمہ ہو جائے۔

یہ دوسری بات نہایت اہم ہے، اس لیے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان اور عمل کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور ایمان وعمل صالح باہم لازم وملزوم ہیں۔

آپ خود فرمائیے کہ ایک شخص تو ایسا ہے کہ جس کے نزدیک یہ کائنات ایک اتفاقی حادثے کے طور پر وجود میں آ گئی ہے اور اس کا پورا نظام خود بخود چل رہا ہے، اور ایک دوسرا شخص ہے جو اس کے برعکس یہ مانتا ہے کہ ایک علیم وخبیر ہستی اور عزیز وحکیم ذات نے ہی اس کائنات کو پیدا کیا ہے اور اُسی کے چلائے اِس کا نظام چل رہا ہے، تو کیا ان دونوں کا عملی رویہ ایک ہی ہوسکتا ہے اور کیا ان کے طرزِ عمل میں زمین وآسمان کا فرق واقع نہیں ہو جائے گا؟ اسی طرح ایک شخص وہ ہے جس کے نزدیک زندگی بس یہی زندگی ہے جو ہم اس عالم میں بسر کر رہے ہیں اور موت کے بعد کوئی زندگی نہیں، کوئی حساب وکتاب نہیں، کوئی پوچھ گچھ نہیں اور کوئی جزا وسزا نہیں۔ اور دوسرا شخص یقین رکھتا ہے کہ اصل کتاب زندگی تو موت کے بعد شروع ہوگی۔ یہ زندگی تو بس ایک دیباچے اور مقدمے کی حیثیت رکھتی ہے، اور مرنے کے بعد ہر انسان کو اپنے ہر ہر عمل ہی نہیں ہر ہر قول بلکہ ہر ہر خیال تک کے بارے میں

جوابدہی کرنی ہوگی، تو کیا ان دونوں کے عملی رویے میں مشرق و مغرب کا بُعد پیدا ہونا لازمی نہیں؟ سیدھی سی بات ہے کہ پہلے انسان کا تو فلسفہ ہی یہ بن جائے گا کہ ع

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست!

اور اِس عیش کوشی میں نہ اسے صحیح و غلط کی تمیز رہے گی، نہ جائز و ناجائز کی اور نہ حلال وحرام کی۔ اس کے برعکس دوسرا شخص زندگی میں ہر قدم پھونک پھونک کر اُٹھائے گا اور ایک احساس ذمہ داری ہر دم اس کے سر پر مسلط رہے گا۔ گویا ایمان کے نتیجہ میں انسان کی شخصیت میں ایک انقلاب (Transformation) لازمی ہے۔

اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ہمارے یہاں جو یہ خیال عام ہوگیا ہے کہ ایمان جدا ہے اور عمل جدا، تو یہ صرف قانونی درجے میں ہے۔ اس لیے کہ دنیا میں کسی شخص کا مسلمان سمجھا جانا صرف اس کے اقرار باللسان پر مبنی ہے اور اس میں انسان کا عمل زیر بحث نہیں لایا جاسکتا، لیکن وہ حقیقی ایمان جو عبارت ہے یقین قلبی سے لازماً عمل میں انقلاب پیدا کر دیتا ہے، حتیٰ کہ اگر عمل میں تبدیلی پیدا نہ ہو تو یہ اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ حقیقی ایمان موجود نہیں ہے۔

یہی وہ حقیقت ہے جسے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد احادیث میں واضح فرمایا ہے۔ چنانچہ آپ ؐ کا ایک قول مبارک ہے کہ **﴿لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَا اَمَانَةَ لَهٗ وَلَا دِیْنَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهٗ﴾** (رواہ البیہقی: عن انسؓ) یعنی اس شخص کا کوئی ایمان نہیں جس میں امانت کا وصف نہیں اور جو امانت (Trust) کو ضائع (Betray) کرتا ہے، اور جس میں عہد کی پاسداری نہیں اس کا کوئی دین نہیں۔ غور کریں کہ کتنا پیارا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اندازِ بیان اور کتنی دو اور دو چار کی طرح واضح ہے وہ بات جو آپ ؐ نے فرمائی ہے۔

اسی طرح ایک موقع پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار قسم کھا کر فرمایا: **﴿وَاللّٰهِ لَا یُؤْمِنُ، وَاللّٰهِ لَا یُؤْمِنُ، وَاللّٰهِ لَا یُؤْمِنُ﴾** ”خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے، خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے، خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے۔“ اس پر صحابہؓ نے سوال کیا: **﴿مَنْ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ﴾** ”حضور صلی اللہ علیہ وسلم کس کی بابت ارشاد فرما رہے ہیں؟“ تو آپ ؐ نے جواباً ارشاد فرمایا: **(اَلَّذِیْ لَا یَاْمَنُ جَارُهٗ بَوَائِقَهٗ)** (متفق علیہ: عن ابی ہریرہؓ) یعنی وہ شخص جس کی ایذا رسانیوں سے اس کا ہمسایہ چین میں نہ ہو! غور فرمائیے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کس قدر تاکید کے ساتھ ایمان کی نفی کلی کا اعلان فرما رہے ہیں اور وہ بھی کسی گناہ کبیرہ پر نہیں، شرک، قتل ناحق، زنا یا چوری، ڈاکے پر نہیں، بلکہ صرف ایک ایسی بات پر جسے ہم زیادہ سے زیادہ بداخلاقی پر محمول کرتے ہیں۔ کیا اس کے بعد بھی اس خیال کے لیے گنجائش ہے کہ ایمان اور عمل دو علیحدہ چیزیں ہیں اور باہم لازم وملزوم نہیں؟ اس غلط فہمی کی نفی کے لیے قرآن مجید کا مستقل اسلوب یہ ہے کہ ایمان کے بعد اس کے لازمی نتیجے کے طور پر عمل صالح کا ذکر ضرور کر دیا جاتا ہے۔

اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ جب تک ایمان صرف **اقرارٌ باللسان** کے درجے میں رہتا ہے یعنی صرف قول تک محدود ہوتا ہے، عمل اِس کے خلاف ہوسکتا ہے۔ اس لیے کہ قول و فعل کا تضاد تو اِس دنیا کی ایک عام چیز ہے۔ لیکن جب یہی ایمان **تصدیقٌ بالقلب** کے درجے کو پہنچ جاتا ہے، یعنی یقین بن کر دل میں اُتر جاتا ہے تو پھر عمل کا بدل جانا لازمی ہے۔ اس لیے کہ انسان کا عملی رویہ اِس کے یقین ہی پر مبنی ہوتا ہے۔ جیسے ہمیں یقین ہے کہ آگ جلا دیتی ہے تو ہم آگ میں ایک انگلی تک ڈالنے کو تیار نہیں ہوتے۔ بلکہ یقین تو دُور کی بات ہے انسان کا عمل تو گمان سے بھی متاثر ہو جاتا ہے۔ جیسے ہمیں معلوم ہے کہ تمام سانپ زہریلے نہیں ہوتے، لیکن ایک گمان سا ہوتا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ یہ سانپ زہریلا ہو، تو اس گمان کے نتیجہ میں ہم لازماً اس سے بچتے ہیں۔ تو پھر اگر کسی شخص کو یقین ہو کہ خدا ہے اور وہ سمیع و بصیر اور علیم وخبیر ہے، میری ہر حرکت بلکہ میری زبان سے نکلنے والا ہر ہر لفظ، بلکہ اس سے بڑھ کر میرے دل کا ہر ارادہ اس کے علم میں ہے اور مجھے مر کر لازماً اس کے حضور حاضر ہونا ہے اور اپنے پورے کارنامۂ زندگی کی جوابدہی کرنی ہے، پھر نہ اس کی سزا و پکڑ سے کہیں بھاگ کر بچ نکلنے کا کوئی امکان ہے اور نہ ہی کسی سفارش یا کچھ دے دلا کر چھوٹ جانے کی کوئی صورت ہے، تو کیسے ممکن ہے کہ اس کے عمل میں تبدیلی پیدا نہ ہو اور وہ گناہ اور معصیت کی زندگی بسر کرتا رہے۔ یہی امر ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول مبارک میں بیان ہوا ہے کہ:

((لَا یَزْنِی الزَّانِیْ حِیْنَ یَزْنِیْ وَھُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا یَسْرِقُ السَّارِقُ حِیْنَ یَسْرِقُ وَھُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا یَشْرَبُ الْخَمْرَ حِیْنَ یَشْرَبُھَا وَھُوَ مُؤْمِنٌ))

''یعنی کوئی بدکار حالت ایمان میں بدکاری نہیں کرتا اور نہ کوئی
چور حالت ایمان میں چوری کرتا ہے اور نہ کوئی شرابی حالت
ایمان میں شراب نوشی کرتا ہے۔'' (متفق علیہ: عن ابی ہریرۃؓ)

بلکہ ان گناہوں کا صدور ہوتا ہی اس وقت ہے جب کسی سبب سے حقیقی ایمان دل سے زائل ہو جاتا ہے۔ گویا ایمان اور عمل صالح کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور یہ دونوں باہم لازم وملزوم ہیں۔ بلکہ صحیح اور درست عمل اور عمدہ اخلاق اور اعلیٰ کردار ایمان حقیقی کا لازمی جزو ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ العصر میں ایمان کے بعد نجات کی دوسری شرط کے طور پر عمل صالح کا ذکر کر دیا گیا۔

عمل صالح کا اصل مفہوم

عمل صالح کا عام ترجمہ اچھے اور نیک اعمال سے کیا جاتا ہے۔ لیکن خود اس لفظ کی گہرائی میں اتریئے تو مزید حقائق پر سے پردہ اُٹھتا ہے۔ اس لیے کہ ایک طرف تو اس کے باوجود کہ عمل اور فعل دو نہایت قریب المفہوم الفاظ ہیں، اِن کے معنی میں ایک باریک سا فرق بھی ہے اور وہ یہ کہ فعل کسی بھی کام کو کہہ دیں گے لیکن عمل کا اطلاق عام طور پر محنت طلب اور مشقت بخش کام پر ہوتا ہے، اور دوسری طرف صالح کا اطلاق ہر اُس چیز پر ہوتا ہے جس میں ترقی اور نشوونما کی صلاحیت موجود ہو۔ اب ان دونوں کو جوڑیئے تو معلوم ہوگا کہ اس اصطلاح کی اصل حقیقت یہ ہے کہ انسان کو اپنا وہ اصل مقام حاصل کرنے کے لیے جس پر اس کی بالقوہ (Potentially) تخلیق ہوئی ہے، ایک محنت اور جدوجہد کی ضرورت ہے اور ایک چڑھائی چڑھنی لازم ہے جس کا جامع عنوان عمل صالح ہے۔ گویا یہ وہی بات ہوئی جو کسی شاعر نے ان الفاظ میں بیان کی کہ ؎

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

سورۃ التین متعدد اعتبارات سے سورۃ العصر سے بہت مشابہ ہے، چنانچہ اس میں اِسی حقیقت کو زیادہ وضاحت سے بیان کیا گیا ہے کہ:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ○ ثُمَّ رَدَدْنٰہُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ○ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾

یعنی انسان کی تخلیق اصلاً تو نہایت اعلیٰ مقام پر ہوئی تھی اور اِسے جنوں پر ہی نہیں فرشتوں پر بھی فضیلت عطا کر کے خلافت و نیابت الٰہی سے سرفراز فرمایا گیا تھا، لیکن پھر عملاً اسے عالم آب وگل میں مقید اور نفس امارہ کے پھندوں میں گرفتار کر کے گویا نیچے والوں میں سب سے نچلے مقام پر ڈال دیا گیا۔ اب اپنے اصل مقام کی بازیافت کے لیے لازم ہے کہ وہ علم حقیقی بھی حاصل کرے، یعنی ایمان کے نور سے اپنے باطن کو منور کرے اور عمل صحیح بھی اختیار کرے، یعنی اعمال صالح سے اپنے ظاہر کو مزین کرے اور شریعت اور طریقت کی راہوں پر گامزن ہو! چنانچہ یہی اس کی نجات (Salvation) کے ابتدائی لوازم ہیں۔

تواصی کے معنی

سورۃ العصر کے آخری حصہ میں دوبار جو لفظ تَوَاصَوا آیا ہے اس کا مصدر ''تواصی'' ہے اور یہ وصیت سے بنا ہے جس کے معنی ہیں تاکید اور اصرار کے ساتھ کسی بات کی تلقین و نصیحت۔ پھر یہ مصدر باب تفاعل سے ہے، جس کے خواص میں ایک تو باہمی اشتراک ہے اور دوسرے شدت ومبالغہ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک تو یہ عمل تواصی پورے زور وشور اور پوری قوت وشدت کے ساتھ مطلوب ہے، اور دوسرے اِس مرحلے پر ایک اجتماعیت کا قیام ناگزیر ہو جاتا ہے جو باہم ایک دوسرے کو حق اور صبر کی تلقین کے اُصول پر مبنی ہو۔

حق کے معنی

اسی طرح لفظ حق بھی معنی ومفہوم کے اعتبار سے بہت وسیع ہے اور اس کا اطلاق ہر اس چیز پر ہوتا ہے جو واقعی ہو (یعنی محض خیالی اور وہمی نہ ہو) یا عقل کے نزدیک مسلم ہو یا اخلاقاً واجب ہو یا بامقصد اور غرض وغایت کی حامل ہو (یعنی بے کار اور لایعنی وعبث نہ ہو)۔

تو معلوم ہوا کہ تواصی بالحق کے معنی ہوں گے ہر اُس بات کا اقرار و اعلان اور ہر اس چیز کی دعوت و تلقین جو واقعی اور حقیقی ہو یا عقلاً ثابت ہو یا اخلاقاً واجب ہو۔ گویا حق کے دائرے میں چھوٹی سے چھوٹی صداقت سے لے کر کائنات کے بڑے بڑے حقائق و حقوق سب داخل ہو گئے، اور تواصی بالحق کے ذیل میں چھوٹی سے چھوٹی اخلاقی نصیحتوں سے لے کر اس سب سے بڑے حق کا اعلان بھی شامل ہو گیا کہ اس کائنات کا مالک حقیقی صرف اللہ ہے، اور صرف اُسی کو حق پہنچتا ہے کہ دنیا میں اُس کا حکم چلے اور اسی کا قانون نافذ ہو۔ پھر یہ کہ اِس حق کا صرف اعتراف و اعلان ہی نہ ہو، بلکہ اس کی عملی تنفیذ کے لیے جدوجہد کی جائے۔

اس طرح تواصی بالحق کی جامع اصطلاح میں وہ سب مفہوم شامل ہیں جو قرآنِ حکیم کی بہت سی اصطلاحوں میں مضمر ہیں، جیسے امر بالمعروف و نہی عن المنکر، یعنی ہر نیکی اور بھلائی کی دعوت دینا اور اس کا حکم دینا اور ہر بدی اور برائی سے منع کرنا اور روکنا، یا تواصی بالمرحمہ یعنی لوگوں کو باہم ایک دوسرے پر شفقت اور نرمی کرنے کی تلقین و نصیحت، یا دعوت الی اللہ یعنی لوگوں کو اپنے مالک حقیقی کی معرفت حاصل کرنے اور عبادت اختیار کرنے کی دعوت دینا یا جہاد فی سبیل اللہ یعنی اللہ کے دین کے غلبے کی جدوجہد کرنا اور اس کے لیے اپنی جانیں کھپانا اور مال صرف کرنا۔

صبر کا مفہوم

اسی طرح صبر کا مفہوم بھی بہت وسعت کا حامل ہے اور اس کا اصل ماحصل یہ ہے کہ انسان اپنے طے کردہ راستے پر گامزن رہے اور اِس سے اُسے نہ کوئی تکلیف یا مصیبت ہٹا سکے نہ لالچ و حرص۔ گویا اسے اپنی راہ سے نہ تو کسی قسم کے تشدد (Presecution) سے ہٹایا جا سکے نہ کسی طرح کے طمع اور لالچ (Temptation) سے، بلکہ وہ ہر صورت میں ثابت قدم رہے اور ثبات و استقلال اور پامردی و بہادری کے ساتھ حق پر خود بھی قائم رہے اور دوسروں کو بھی اس کی دعوت دیتا چلا جائے۔

تواصی بالحق اور تواصی بالصبر لازم و ملزوم ہیں

جس طرح ہم دیکھ چکے ہیں کہ ایمان اور عمل صالح کا چولی دامن کا ساتھ ہے، اسی طرح تواصی بالحق اور تواصی بالصبر بھی باہم لازم و ملزوم ہیں۔ اس لیے کہ حق کی دعوت کو دُنیا میں بالعموم گوارا نہیں کیا جاتا اور اس کی مزاحمت لازماً ہوتی ہے، چنانچہ اہل حق کو لازماً تکالیف اور مصائب کا سامنا رہتا ہے۔

ہم سب کو اس کا تجربہ ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی نصیحت بھی بسا اوقات لوگوں کو سخت ناگوار معلوم ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر کسی شخص کو کسی دوسرے کے پانچ روپے ادا کرنے ہوں اور وہ لیت و لعل سے کام لے رہا ہو اور آپ اس سے کہیں کہ بھلے آدمی اس کے پانچ روپے ادا کر دو، تو اس کی تیوری پر بل پڑ جائیں گے اور وہ آپ سے سخت طیش میں کہے گا کہ آپ کون ہوتے ہیں ہمارے معاملے میں دخل دینے والے؟ اس پر قیاس کر لیجیے کہ جب بڑے بڑے حقوق کی ادائیگی کی تلقین ہو تو کیسی کچھ ناگواری (Resentment) کا سامنا کرنا ہوگا اور کتنی مزاحمت و مخالفت سے سابقہ پیش آئے گا۔

اور یہی مقام اصل میں انسان کی سیرت و کردار کے امتحان کا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حق کی پہچان اور اس کی معرفت اتنی مشکل نہیں جتنا اس کو خود بھی اختیار کرنا اور دوسروں کو بھی اس کی دعوت دینا اور پھر اس راہ میں ثابت قدم رہنا، جسے قرآن مجید کی اصطلاح میں ''استقامت'' کہتے ہیں۔ اسی مرحلہ پر آ کر معلوم ہوتا ہے کہ کون کتنے پانی میں ہے اور آیا سیرت و کردار نام کی کوئی چیز اس کے پاس موجود ہے یا نہیں!

یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم میں بڑے شد و مد (Emphasis) اور نہایت تاکید و توثیق کے ساتھ یہ حقیقت بیان ہوئی کہ اہل ایمان کو لازماً امتحان اور ابتلاء و آزمائش سے سابقہ پیش آتا ہے اور ان کے دعویٰ ایمان کی صداقت کو طرح طرح سے جانچا اور پرکھا جاتا ہے، اور صادق الایمان وہی قرار پاتے ہیں جو ان امتحانات میں ثابت قدم رہیں اور صبر و استقلال کا عملی ثبوت پیش کریں۔

ایمان، عمل صالح اور تواصی کا باہمی ربط

اب تک ہم نے سورۃ العصر میں بیان شدہ نجات کی چار شرائط کو دو دو کے دو جوڑوں میں تقسیم کر کے دیکھ لیا ہے کہ ایک طرف ایمان اور عمل صالح لازم و ملزوم ہیں اور دوسری طرف تواصی بالحق اور تواصی بالصبر بھی باہم لزوم رکھتے ہیں۔ اب ان دو جوڑوں کے مابین جو رشتہ اور تعلق ہے اسے بھی سمجھ لیں تو بات پوری ہو جائے گی۔

یہ فطرت کا عام اُصول ہے کہ کوئی شے نہ ماحول سے متأثر ہوئے بغیر رہ سکتی ہے نہ اسے متأثر کیے بغیر۔ برف میں جو خنکی ہے وہ اپنے ماحول میں لازماً سرایت کرے گی اور آگ کی حرارت اپنے ماحول کو لازماً گرم کر دے گی۔ یہی معاملہ اخلاقیات کے میدان میں ہے۔ اگر کسی انسان میں عمل صالح حقیقتہً پیدا ہو جائے تو وہ لازماً ماحول میں اثر و نفوذ کرے گا اور اس سے نیکی اور بھلائی لازماً پھیلے گی۔ گویا عمل صالح کا فطری نتیجہ تواصی بالحق ہے۔

انسانی اخلاقیات میں یہ اُصول اور بھی شدت کے ساتھ کارفرما ہوتا ہے۔ اگر اجتماعی ماحول خراب ہے تو اس کی خرابی لازماً افراد کی زندگیوں میں سرایت کرے گی، اور اس سے بچنے کی ایک ہی راہ ممکن ہے کہ ماحول کو تبدیل کر دیا جائے یا کم از کم اس کو تبدیل کرنے کی جدوجہد مسلسل جاری رکھی جائے۔ اس طرح اگر ماحول نہ بھی تبدیل ہو تو کم از کم وہ فرد ''جارحیت بہترین دفاع ہے'' (Best Defence is Offence) کے اُصول پر عمل پیرا ہو کر اپنا دفاع ضرور کر لے گا۔ اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ﴿مَنْ رَأٰی مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ ، فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ ، فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ وَذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِيْمَانِ﴾ (رواہ مسلم: عن ابی سعید الخدریؓ) تم میں سے جو کوئی کسی برائی کو دیکھے اس کا فرض ہے کہ اسے بزورِ بازو (نیکی سے) بدل دے، پھر اگر اس کی قوت نہ رکھتا ہو تو زبان سے ضرور منع کرے، اور اگر اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو کم از کم دل سے ضرور مدافعت کرے۔ یعنی دل میں ضرور بُرا جانے اور اس کو نہ روک سکنے پر متأسف ہو اور یہ ایمان کا ضعیف ترین درجہ ہے۔

پھر تواصی بالحق انسان کی شرافت کا بھی لازمی تقاضا ہے۔ اس لیے کہ جو حق کسی انسان پر منکشف ہوا ہے اور جسے خود اس نے اختیار کیا ہے، اس کی انسان دوستی کا لازمی تقاضا ہے کہ اسے دوسروں کے سامنے بھی پیش کرے، تاکہ زیادہ سے زیادہ انسان اس سے نفع اندوز ہوں اور اس کی برکتوں سے متمتع ہو سکیں۔ اسی لیے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ﴿لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يُحِبُّ لِاَخِيْهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ﴾ (رواہ مسلم: عن ابی سعید الخدریؓ) یعنی تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں قرار پا سکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے وہی کچھ پسند نہ کرے جو اپنے لیے کرتا ہے۔

اور آخری درجہ میں یہ انسان کی غیرت اور حمیت کا تقاضا بھی ہے کہ جس حق کو اس نے خود قبول کیا ہے اس کا پرچار کرے، اس کا مبلغ اور علمبردار بنے اور اس کا بول بالا کرنے کے لیے تن من دھن سے جدوجہد کرے۔

سیدھی سی بات ہے کہ اگر انسان ایک خاص طرز کو اختیار کرتا ہے اور ماحول کسی اور رنگ میں رنگا ہوا ہے تو نظری طور پر دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ ؏ ''زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز!'' کے مطابق خود بھی ماحول ہی کے رنگ میں رنگا جائے، تاکہ دوئی ختم ہو جائے اور تصادم باقی نہ رہے، اور دوسرے یہ کہ ؏ ''زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز!'' کی روش اختیار کر کے اور ماحول سے ٹکر لے کر اسے اپنے رنگ میں رنگنے کی کوشش کرے۔ اب ظاہر ہے کہ ایک شریف، باوقار، غیور اور باحمیت انسان تو صرف ایک ہی راہ اختیار کر سکتا ہے اور وہ دوسری ہے نہ کہ پہلی۔ وہ اس کو تو گوارا کر لے گا کہ ''بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا!'' کے مصداق اپنی جان دے دے، لیکن اسے ہرگز گوارا نہیں کر سکتا کہ تن آسانی اور عافیت کوشی کی راہ پر چل کر حق سے غداری کا مرتکب ہو جائے۔

الغرض...... جس اعتبار سے بھی دیکھا جائے نظر یہی آتا ہے کہ ایمان، عمل صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر ایک جانب تو نجات کے ناگزیر لوازم ہیں اور دوسری جانب خود باہم لازم و ملزوم ہیں۔ بلکہ ان چاروں پر علیحدہ علیحدہ قدرے گہرائی میں اتر کر غور کرنے سے جو حقیقت منکشف ہوئی، وہ یہ ہے کہ یہ چاروں ایک ہی وحدت کے ناقابلِ تقسیم پہلو

ہیں اور ایک ہی کل کے اجزائے غیر منفک ہیں۔ گویا بقولِ اقبالؒ: عمل صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر ع ''یہ سب کیا ہیں فقط اک نقطہ ایماں کی تفسیریں!'' ایمان اگر حقیقی ہو جائے تو اس سے عمل صالح ضرور پیدا ہوگا، اور عمل صالح اگر پختہ ہو جائے تو لازماً تواصی بالحق پر منتج ہوگا، اور تواصی بالحق اگر واقعی اور حقیقی ہے تو تواصی بالصبر کا مرحلہ لازماً آ کر رہے گا، یہاں تک کہ اس کی عکسی صورت (Converse Preposition) بھی بالکل درست ہے۔ یعنی یہ کہ تواصی بالصبر کا مرحلہ نہیں پیش آیا تو یہ قطعی ثبوت ہے اس کا کہ دعوت پورے حق کی نہیں ہے، بلکہ اس کے صرف کسی بے ضرر سے جزو کی ہے، اور اگر دعوت کا مرحلہ نہیں آتا تو یہ حتمی ثبوت ہے اس کا کہ انسان کا اپنا عمل صحیح اور پختہ نہیں ہے، اور اگر عمل درست نہیں ہو رہا تو یہ یقینی ثبوت ہے اس کا کہ ایمان حقیقی ہی موجود نہیں۔

گویا سورۃ العصر نجات کی جس شاہراہ کی طرف راہنمائی فرماتی ہے اور انسانی کامیابی کے لیے جس صراطِ مستقیم کی نشاندہی کرتی ہے اس کے چار سنگ ہائے میل ہیں۔ پہلا ایمان، دوسرا عمل صالح، تیسرا تواصی بالحق اور چوتھا تواصی بالصبر۔

اسوۂ محمدی ﷺ

اور اس کی کامل اور مکمل مثال ہے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ جس میں یہ چاروں چیزیں اپنی بلند ترین شان کے ساتھ بتمام وکمال موجود ہیں۔

حضورؐ نے سب سے پہلے اپنی اور کائنات کی حقیقت پر مطلع ہونا چاہا اور جب بفحوائے ﴿وَوَجَدَكَ ضَآلاً فَهَدٰى﴾ کے جبریل امین علیہ السلام نے حقائق کا کامل انکشاف کیا تو اس کی تصدیق کی اور ایمان لے آئے۔ جیسے کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا کہ:

﴿ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ﴾

''ایمان لایا رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس پر جو نازل کیا گیا اس پر اس کے رب کی جانب سے اور ایمان لائے اہل ایمان۔''

دوسری طرف آپ کی زندگی اخلاقِ حسنہ کا کامل نمونہ اور خلق عظیم کا شاہکار تھی، جیسے کہ فرمایا گیا:

﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ﴾

''آپ یقیناً نہایت اعلیٰ اخلاق کے حامل اور اخلاق کے بلند ترین مقام پر فائز ہیں۔''

ایمان اور عمل صالح کے ان بنیادی تقاضوں کو بتمام وکمال پورا کرنے کے بعد پھر مسلسل تئیس برس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حق کی دعوت اور ذاتِ حق سبحانہٗ وتعالیٰ کی کبریائی کے اعلان ونفاذ کی انتھک جدوجہد میں صرف کیے اور اس راہ میں ہر تکلیف سہی، ہر مصیبت کو برداشت کیا، ہر مشکل کو جھیلا اور ہر مخالفت کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ چنانچہ شعب بنی ہاشم میں تین سال کی شدید ترین قید کی صعوبت بھی سہی، طائف کے بازاروں میں اوباشوں کی فقرہ بازی اور سنگ باری بھی برداشت کی، بدر اور اُحد میں خود اپنے دندانِ مبارک کے علاوہ اپنے قریب ترین اعزہ اور عزیز ترین جاں نثاروں کی جانوں کا ہدیہ بھی بارگاہِ ربانی میں پیش کیا، اور تئیس برس کی شبانہ روز محنت اور مشقت سے بالآخر حق کا بول بالا کر دیا اور خدا کے دین کو جزیرہ نمائے عرب میں غالب کر کے ہی رفیق اعلیٰ کی طرف مراجعت اختیار فرمائی۔

﴿فصلی اللہ علیہ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَسَلَّم تسليمًا كثيرًا كثيرًا﴾

گویا آنحضورؐ کی حیات طیبہ سورۃ العصر کی مجسم تفسیر ہے! فداہ ابی و امّی۔

تو حضرات! یہ ہے سورۃ العصر کے مفہوم کی مختصر تشریح۔ اب آپ کو اچھی طرح سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ کیوں میں نے اِسے قرآن مجید کی جامع ترین سورت قرار دیا تھا اور کیوں امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ اگر لوگ غور وفکر سے کام لیں تو تنہا یہی مختصر سی سورت اِن کی ہدایت وراہنمائی کے لیے کافی ہے۔

سورۂ ماقبل اور سورۂ مابعد سے تعلق

اب ذرا ایک نظر قرآن مجید میں اس سورۂ مبارکہ کی سابق اور لاحق سورتوں پر بھی ڈال لیجئے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ انسان کے رویے کی درستی کا تمام تر انحصار اس پر ہے کہ اس کے دل ودماغ میں کامیابی اور ناکامی کا اصل معیار اور نفع ونقصان کا صحیح تصور نہ صرف یہ کہ جاگزیں ہوجائے بلکہ ہمیشہ مستحضر بھی رہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر لازماً انسان کے سامنے ایک ہی چیز بطورِ مقصود ومطلوب رہ جاتی ہے اور وہ ہے مال واسبابِ دنیوی کی بہتات اور کثرت کی طلب، جو اس کے دل ودماغ پر اس درجہ مسلط اور مستولی ہوجاتی ہے کہ کائنات اور خود اپنی زندگی کی عظیم حقیقتوں سے غافل کردیتی ہے اور غفلت کا یہ پردہ صرف موت ہی پر چاک ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی کیفیت کا بیان ہے اُس سورۂ مبارکہ میں جو قرآن مجید میں سورۃ العصر سے پہلے ہے، یعنی سورۃ التکاثر۔

اور پھر اس کا جو نتیجہ نکلتا ہے یعنی یہ کہ انسان صحیح وغلط میں بھی تمیز نہیں کرتا اور جائز و ناجائز اور حلال وحرام کا فرق بھی بالکل اُٹھا دیتا ہے، یہاں تک کہ دولت کے انبار لگا لینے کو اصل کامیابی سمجھ بیٹھتا ہے اور اخلاق کے تمام محاسن سے تہی دست ہوجاتا ہے، اور اس کی شخصیت تمام معائب کی جامع ہوجاتی ہے۔ تو اس کی تصویر کھینچ دی گئی ہے اس سورۃ میں جو سورۃ العصر کے بعد ہے، یعنی سورۃ الھمزۃ۔ میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ میرا اور آپ کا حشر ایسا ہو اور ہم اس انجامِ بد سے دوچار ہوں۔

خاتمۂ کلام

آخر میں آپ میں سب حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے میری ان طویل گذارشات کو نہایت توجہ سے سنا اور بارگاہِ خداوندی میں دُعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں حق کی پہچان اور معرفت بھی عطا فرمائے اور اس پر عملاً قائم ہونے کی توفیق بھی عطا فرمائے اور دوسروں کو اس کی طرف بلانے اور دعوت دینے کی ہمت اور اس راہ کی مصیبتوں اور تکالیف پر صبر کی توفیق بھی ارزانی فرمائے!

واخر دعوانا ان الحمدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمین

ضمیمہ (۱)

۱۔ سورۃ العصر سے متعلق

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا طرزِ عمل

''عَنْ ابی مُزَیْنَۃَ الدَّارِمِیُّ رَضِی الله تعالیٰ عنه قَالَ: کَانَ الرَّجُلاَنِ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِیّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ اِذَا الْتَقَیَا لَمْ یَتَفَرَّقَا حَتّٰی یَقْرَأَ اَحَدُھُمَا عَلَی الْاٰخَرِ سُوْرَۃَ الْعَصْرِ ثُمَّ یُسَلِّمُ اَحَدُھُمَا عَلَی الْاٰخَرِ.''

(اَخْرَجَہُ الطبرانی فی الاوسط والبَیْھَقِی فی الشعب)

ترجمہ

''حضرت ابومزینہ دارمی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے دو حضرات جب باہم ملاقات فرماتے تو اس وقت تک ایک دوسرے سے جدا نہ ہوتے جب تک ان میں سے ہر ایک دُوسرے کو سورۃ العصر نہ سنا لیتا۔ اس کے بعد ہی ان میں سے ایک دُوسرے کو (الوداعی) سلام کہتا۔''

۲۔ سورۃ العصر کے بارے میں

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے دو حکیمانہ اقوال

..................(۱)..................

لَوْتَدَبَّرَ النَّاسُ ھٰذِہِ السُّوْرَۃَ لَوَسِعَتْھُمْ

(بحوالہ تفسیر ابن کثیرؒ)

''اگر لوگ اس سورت (سورۃ العصر) پر غور کریں تو وہ اسی میں پوری رہنمائی اور کامل ہدایت پالیں گے۔''

..................(۲)..................

لَوْلَمْ یُنَزَّلْ مِنَ الْقُرْاٰنِ سِوَاھَا لکفتِ النَّاسَ

(بحوالہ تفسیر پارہ عمّ از محمد عبدہٗ)

''اگر قرآن حکیم میں سوائے اس سورۂ مبارکہ کے اور کچھ بھی نازل نہ ہوتا تو صرف یہ سورت ہی لوگوں (کی ہدایت) کے لیے کافی ہوتی۔''

۳۔ تفسیر سورۃ العصر کے ضمن میں

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کا قول فیصل

ھٰذِہِ الْاٰیَۃُ فِیھَا وَعِیْدٌ شَدِیْدٌ وَذٰلِکَ لِاَنَّہٗ تَعَالٰی حَکَمَ بِالْخِسَارِ عَلٰی جَمِیْعِ النَّاسِ اِلَّا مَنْ کَانَ اٰتِیًا بِھٰذِہِ الْاَشْیَاءِ الْاَرْبَعَۃِ: وَھِیَ الْاِیْمَانُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ وَالتَّوَاصِی بِالْحَقِّ وَالتَّوَاصِی بِالصَّبْرِ، فَدَلَّ ذٰلِکَ عَلٰی اَنَّ النَّجاۃَ مُعَلَّقَۃٌ

بِمَجْمُوْعِ هٰذِهِ الْاُمُوْرِ وَاِنَّهٗ كَمَا يَلْزَمُ الْمُكَلَّفَ تَحْصِيْلُ مَا يَخُصُّ نَفْسَهٗ فَكَذٰلِكَ يَلْزَمُهٗ فِيْ غَيْرِهٖ اُمُوْرٌ: مِنْهَا الدُّعَاءُ اِلَى الدِّيْنِ وَالنَّصِيْحَةُ وَالْاَمْرُ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّهْيُ عَنِ الْمُنْكَرِ

ترجمہ

''اس آیۂ مبارکہ میں بڑی سخت وعید وارد ہوئی ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کی تباہی کا فیصلہ صادر فرما دیا ہے سوائے ان کے جو ان چار شرائط کو پورا کریں، یعنی ایمان، عمل صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر۔ اس سے معلوم ہوا کہ نجات ان چاروں کے مجموعے پر منحصر ہے اور ہر انسان جس طرح اپنی ذات کے بارے میں مسئول ہے، (ایمان اور عمل صالح کے لیے) اسی طرح دوسروں کے بارے میں بعض امور کا مکلّف ہے، جیسے دین کی دعوت، تلقین ونصیحت اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر۔''

۴۔ اس کتابچے میں مذکور

احادیث نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی تخریج

..................(۱)..................

﴿عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، قَالَ قَلَّمَا خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَّا قَالَ: لَا اِيْمَانَ لِمَنْ لَا اَمَانَةَ لَهٗ وَلَا دِيْنَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهٗ﴾ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

..................(۲)..................

﴿عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ، وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ، وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ قِيْلَ: ''مَنْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ''؟ قَالَ: ''اَلَّذِيْ لَا يَاْمَنُ جَارُهٗ بَوَائِقَهٗ!''﴾ (متفق علیہ)

..................(۳)..................

﴿عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا يَزْنِي الزَّانِيْ حِيْنَ يَزْنِيْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا يَسْرِقُ السَّارِقُ حِيْنَ يَسْرِقُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا يَشْرَبُ الْخَمْرَ حِيْنَ يَشْرَبُهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ﴾ ...... الحديث (متفق علیہ)

..................(۴)..................

﴿عَنْ أَبِيْ سَعِيْدِ نِ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: مَنْ رَأٰى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ فَاِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ، فَاِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ، وَذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِيْمَانِ﴾ (رواہ مسلم)

..................(۵)..................

﴿عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى يُحِبَّ لِاَخِيْهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ﴾ (رواہ مسلم)

..................(٦)..................

﴿"قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اَوْحَى اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ اِلٰى جِبْرَئِيْلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ اَنِ اقْلِبْ مَدِيْنَةَ كَذَا وَكَذَا بِاَهْلِهَا" قَالَ فَقَالَ: "يَا رَبِّ اِنَّ فِيْهَا عَبْدَكَ فُلَانًا لَمْ يَعْصِكَ طَرْفَةَ عَيْنٍ" قَالَ فَقَالَ: "اِقْلِبْهَا عَلَيْهِ وَعَلَيْهِمْ فَاِنَّ وَجْهَهُ لَمْ يَتَمَعَّرْ فِيَّ سَاعَةً قَطُّ﴾

(امام بیہقی بحوالہ خطبات الاحکام، تالیف: مولانا اشرف علی تھانویؒ)

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْ عِبَادِكَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ.

اٰمِيْن، يَا رَبَّ الْعٰلَمِيْن!

ضمیمہ (۲)

سورۃ العصر کی عظمت و جامعیت

اور اس کے ساتھ میرے تعاہد ذہنی کی تاریخ،

میری بعض تعبیرات پر چند علماء کا اعتراض اور اس کے ضمن میں میری وضاحت، اور لفظ "وَتَوَاصَو" سے مولانا فراہیؒ کا وجوبِ قیامِ خلافت پر استدلال اور صاحبِ تدبر قرآن کا اس سے افسوس ناک اِغماض!

(اس کتاب کی طبع یازدہم کے موقع پر مؤلف کی وضاحت)

O

راقم الحروف کے قلب و ذہن پر سورۃ العصر کی عظمت کا اولین نقش اس وقت قائم ہوا تھا جب اغلباً ۱۹۵۳ء میں مولانا امین احسن اصلاحی کا ترجمہ کردہ "مجموعہ تفاسیر فراہی" پہلی بار شائع ہوا۔

خوش قسمتی سے اس سے متصلاً قبل راقم قرآن پر تدبر اور تفکر کے اُس اسلوب اور طریق سے متعارف ہو چکا تھا جو ابفراحیؒ مکتبہ فکر کے عنوان سے معروف و مشہور ہے، اس لیے کہ دسمبر ۵۱ء اور جولائی ۵۲ء کے دوران راقم نے جو دو تربیت گاہیں اسلامی جمعیت طلبہ کے زیر اہتمام بحیثیت ناظم جمعیت لاہور اور ناظم جمعیت پنجاب منعقد کی تھیں، ان میں قرآن حکیم کے بعض مقامات دو مرتبہ مولانا فراہیؒ کے شاگردِ رشید مولانا اصلاحی سے لفظاً لفظاً پڑھ لیے تھے۔

"مجموعہ تفاسیر فراہی ؒ" میں سے راقم سب سے زیادہ متاثر تو "مقدمہ تفسیر نظام القرآن" سے ہوا جس کا ایک ایک لفظ راقم کے ذہن اور شعور کا جزو بنتا چلا گیا۔ رہیں مختلف

اور متفرق سورتوں کی تفسیریں تو ان میں سے راقم کے ذہن وقلب نے سب سے زیادہ تأثر
تفسیر سورۃ العصر سے قبول کیا، جس کے جملہ مباحث راقم کے قرطاس ذہن ہی نہیں لوح
قلب پر بھی نقش ہوتے چلے گئے! باقی سورتوں کی تفسیر کے ضمن میں تو بہت سے مقامات کے
بارے میں اُس وقت بھی میرا تاثر یہ تھا کہ اُن کے مطالب کو نظم قرآن اور ربط آیات کے
اُصولوں پر منطبق کرنے میں کسی قدر تکلف ہی نہیں باضابطہ کھینچ تان کا انداز پایا جاتا ہے۔
(اور اب تو بعض تعبیرات سے مجھے شدید اختلاف بھی ہے)، لیکن سورۃ العصر کی تفسیر کے
ایک ایک لفظ سے راقم کو اُس وقت بھی اتفاق تھا اور آج بھی، جب کہ پورے چالیس سال
بیت چکے ہیں، اور اس طویل عرصے کے دوران ذہن وفکر کے بہت سے نئے دریچے وا
ہوئے اور تفسیر وتاویل قرآن کے ضمن میں بعض نئے زاویہ ہائے نگاہ سے تعارف ہوا، نتیجتاً
میرے فکر قرآنی میں بعض نئے اعراض وابعاد (Dimensions) کا اضافہ ہوا............سورۃ
العصر کے جو مطالب ومعانی مولانا فراہیؒ نے بیان کیے تھے ان کی صحت اور درستی پر انشراح و
اطمینان میں نہ صرف یہ کہ کمی نہیں ہوئی، بلکہ اضافہ ہی ہوا، اور خاص طور پر شرائطِ نجات اور
لوازمِ فلاح کے جامع بیان یا بالفاظ دیگر صراطِ مستقیم کے سنگ ہائے میل کی نشاندہی کے ضمن
میں، اس سورۂ مبارکہ کی عظمت کا نقش جلی سے جلی تر اور عمیق سے عمیق تر ہوتا چلا گیا۔ چنانچہ
سورۃ العصر کے بارے میں امام شافعیؒ کے الفاظ............یعنی: ''اگر لوگ صرف اسی ایک
سورت پر تدبر کریں تو یہ ان (کی ہدایت) کے لیے کافی ہو جائے''۔ اور ''اگر قرآن میں اس
ایک سورت کے سوا کچھ اور نازل نہ ہوتا تو تنہا یہ سورت بھی لوگوں (کی ہدایت) کے لیے
کفایت کرتی!'' مجھے بالکل اس انداز میں اپنے دل کی آواز محسوس ہونے لگی کہ ع ''متفق
گردید رائے بوعلی با رائے من!''

یہی وجہ ہے کہ جب راقم کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ قرآن کی ''ہدایت'' سے
لوگوں کو متعارف کرانے کے لیے مطالعۂ قرآن حکیم کا ایک مختصر اور منتخب نصاب مرتب کیا
جائے تو اس کی اساس اور بنیاد راقم نے سورۃ العصر ہی کو بنایا۔ پھر اس کے حصہ اوّل میں چند
اور مقامات ایسے شامل کیے جو لوازمِ فلاح کے بیان کی جامعیت کے اعتبار سے اسی کے ہم
پلہ یا لگ بھگ ہیں، اور پھر ایک ایک حصہ اس سورۂ مبارکہ میں بیان شدہ چار شرائط نجات
میں سے ایک ایک کی مزید وضاحت اور تفصیل پر مشتمل مقامات کے لیے مختص کیا۔ اور
آخری اور چھٹا حصہ تنہا ''اُمُ المسبحات'' یعنی سورۃ الحدید کے لیے خاص کیا، جو راقم کے
نزدیک جہاں امت مسلمہ سے خطاب کے ضمن میں قرآن حکیم کا جامع ترین مقام بھی ہے
اور ذروۂ سنام بھی، وہاں فوز وفلاح کی بلند ترین منازل یعنی صدیقیت اور شہادت کے
مراتب عالیہ کے حصول کی جدوجہد کے تقاضوں کے بیان کے ضمن میں جامعیت کی حامل
ہونے کے اعتبار سے سورۃ العصر کی کامل مدمقابل ہے............اس طرح گویا مطالعۂ قرآن
حکیم کا میرا مرتب کردہ منتخب نصاب کل کا کل:

﴿كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۝﴾ (ہود:۱)

کے مصداق سورۃ العصر ہی کی تفصیل پر مشتمل ہے۔ اور یہ بات اس اعتبار سے نہایت مناسب
ہے کہ اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو سورۃ العصر کی نسبت پورے قرآنِ حکیم کے ساتھ بالکل وہی
ہے جو آم کی گٹھلی کو اس کے درخت سے ہوتی ہے، یعنی جیسے آم کی گٹھلی میں
بالقوہ (Potentially) آم کا پورا درخت موجود ہوتا ہے، اسی طرح سورۃ العصر میں بالقوہ
پورا قرآن موجود ہے۔ چنانچہ سورۃ العصر میں وارد پانچ کلمات یعنی والعصر، ایمان، عمل صالح،
تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کو قرآن حکیم کے جملہ مضامین کا جامع وکامل انڈکس قرار دیا جا سکتا
ہے۔ اس لیے کہ قرآنِ حکیم میں یا مباحث ایمانی ہیں، جن میں مثبت طور پر توحید، معاد اور
رسالت کو دلائل اور براہین سے ثابت کیا گیا ہے یا ملحدین ومشرکین اور مشککین ومنافقین
کا مدلل رد وابطال ہے...... یا مباحث اعمالِ صالحہ ہیں جن میں نہ صرف بنیادی انسانی
اخلاقیات سے اخلاقِ عالیہ وفاضلہ تک، بلکہ حقوق اللہ سے حقوق العباد تک، اور عبادات سے
معاملات تک شریعت کے جملہ احکام کا احاطہ کرلیا گیا ہے، یا دعوت وتبلیغ، امر بالمعروف ونہی
عن المنکر اور شہادت علی الناس کے مباحث ہیں، جن کا جامع عنوان تواصی بالحق ہے یا جہاد و
قتال فی سبیل اللہ کے مباحث اور ان کے ضمن میں صبر ومصابرت کی تلقین وتاکید ہے جو سب

تواصی بالصبر کے ذیل میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ صرف قصص النبیین اور انباء الرسل ہیں یا مبدأ و معاد کی تفاصیل، یعنی عہد الست اور قصہ آدم و ابلیس سے لے کر جو زمانۂ ماضی سے متعلق ہیں، بعث بعد الموت، حشر و نشر، حساب کتاب، وزنِ اعمال اور پھر اصحاب الاعراف سمیت اہل جنت اور اہل دوزخ کے حالات و کوائف ہیں، جن کا تعلق زمانہ مستقبل سے ہے اور ظاہر ہے کہ ماضی اور مستقبل دونوں کے لیے کلمہ ''والعصر'' جامع ترین عنوان کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس طرح گویا سورۃ العصر کی تشریح و توضیح اور تفصیل و اطناب کا پہلا مرحلہ مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب ہے، اور اسی کی تکمیل پورے قرآن حکیم کی صورت میں ہوتی ہے،...... (عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے بھی ''الفوز الکبیر'' میں جملہ مضامین قرآنی کو پانچ عنوانات کے ذیل میں منقسم قرار دیا ہے،...... اور سورۃ العصر کے حوالے سے بھی قرآن حکیم کے جملہ مضامین پانچ ہی عنوانات کے ذیل میں آ جاتے ہیں)۔

سورۃ العصر کے ساتھ راقم کے اس ''تعاہد ذہنی'' کا نتیجہ ہے کہ ۱۹۶۶ء کے وسط میں جب میں نے ماہنامہ ''میثاق'' لاہور کی ادارت سنبھالی تو جو اوّلین تحریریں میرے قلم سے نکلیں ان میں سورۃ العصر کے تأثرات پر مشتمل وہ تحریر بھی تھی جو اس کتاب میں شامل ہے۔

مطالعہ قرآن حکیم کے متذکرہ بالا منتخب نصاب کا سلسلہ وار اور مکمل درس راقم نے گزشتہ ثلث صدی کے دوران اندرونِ ملک اور بیرون پاکستان اگر سینکڑوں نہیں تو لازماً بیسیوں مرتبہ تو ضرور دیا ہے، جس میں ہر بار آغاز لازماً سورۃ العصر کے درس ہی سے ہوا۔

مزید برآں درس قرآن کی لاتعداد منتشر اور منفرد مجالس میں اس سورۂ مبارکہ کا درس دیا گیا۔ ان میں سے ایچی سن کالج لاہور کا درس اس اعتبار سے ایک اہم علامت (Land Mark) بن گیا کہ یہ کتابچے کی شکل میں شائع ہو کر بلا مبالغہ لاکھوں کی تعداد میں شائع ہوا۔

.................اسی طرح ۱۹۷۹ء کا ٹورنٹو (کینیڈا) کا درس اس بنا پر اہمیت اختیار کر گیا کہ اس کے آڈیو کیسٹ نہایت عمدہ معیار پر تیار ہو کر مشرق و مغرب کے بے شمار ممالک میں ہزاروں کی تعداد میں پھیل گئے، اور ۱۹۸۵ء کا ابوظہبی (متحدہ عرب امارات) کا درس اس لیے مشہور ہو گیا کہ اس کے نہایت عمدہ وڈیو کیسٹ تیار ہو کر شرق و غرب میں دُور دُور تک پہنچ گئے۔

ایچی سن کالج کی تقریر پر مشتمل کتابچہ جب وسیع حلقہ میں شائع ہوا تو بعض علماء کرام کی جانب سے اس پر تنقید بھی ہوئی، جن میں مفتی جمیل احمد تھانوی مدظلہٗ اور مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے حضرت مفتی صاحب نے تو پورا کتابچہ پڑھ کر اعتراض وارد کیے تھے جو سب کے سب خالص فقہی اعتبار سے تھے، جن کا کامل ازالہ اس ایک جملے سے ہو جاتا ہے جو راقم نے احتیاطاً بعد کے تمام ایڈیشنوں میں کور کے اندر کے صفحے پر شائع کرنے کا التزام کیا۔ وَھُوَ ھٰذا:

> ''اس کتابچے پر بعض بزرگوں نے یہ گرفت فرمائی ہے کہ اس کی بعض عبارات سے عاصی اور گنہگار اہل ایمان کے اپنے گناہوں کے بقدر سزا پانے کے بعد جہنم سے رہائی پانے کی نفی ہوتی ہے۔ میں اس سے براءت کرتا ہوں۔ میری رائے بھی یہی ہے کہ جس مسلمان کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان ہوگا وہ بالآخر جہنم سے نجات پا جائے گا۔ اس کتابچے میں جہاں جہاں لفظ نجات آیا ہے اُس سے مراد 'اوّل دھلے میں نجات' ہے، یعنی یہ کہ انسان کو جہنم میں بالکل ڈالا ہی نہ جائے اور میدان حشر ہی میں رحمت و مغفرت خداوندی اُس پر سایہ فگن ہو جائے! مزید برآں اس کتابچے کی زبان، قانون اور فتویٰ کی نہیں بلکہ ترغیب و ترہیب کی ہے............ ورنہ میرا موقف بھی وہی ہے جو امامِ اعظم ابوحنیفہؒ کا ....یعنی گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے بھی کوئی شخص کافر نہیں ہوتا بلکہ مسلمان ہی رہتا ہے۔''

رہا مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ کا معاملہ تو راقم کو ذاتی طور پر معلوم ہے کہ انہوں نے پورے کتابچے کا مطالعہ نہیں کیا تھا، بلکہ ایک فتنہ پرور شخص نے ان کی خدمت میں اس کی بعض عبارات کو سیاق وسباق سے علیحدہ کر کے پیش کر دیا تھا، جس پر مولانا مرحوم نے ایک تنقیدی تحریر ماہنامہ ''بینات'' میں شائع کرا دی۔ افسوس کہ اس کے کچھ ہی دنوں بعد مولانا کا انتقال ہو گیا، ورنہ راقم کو یقین ہے کہ اگر اسے وضاحت کا موقع مل جاتا تو مولانا موصوف یقیناً اپنی تنقید سے رجوع فرما لیتے۔ بہرحال ذاتی طور پر میرے اطمینان کے لیے یہ کافی ہے کہ مولانا مرحوم کے خویش کلاں مولانا طاسین مدظلہٗ نے اس کتابچے کی کلی تصویب فرما کر بڑی حد تک تلافی کی صورت پیدا کر دی ہے۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے مولانا موصوف کی یہ تحریر اس کتابچے کے آخر میں بطورِ ضمیمہ شامل کی جا رہی ہے۔

اس کے باوجود بعض نوجوان علماء کو ایمان اور عمل صالح کے تلازم باہمی کے ضمن میں اس کتابچے کی بعض تعبیرات سے اختلاف ہے تو اس معاملے کی مکمل وضاحت راقم نے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ''حقیقت ایمان'' کے موضوع پر اپنے ان پانچ خطبات میں کر دی ہے، جو مارچ ۱۹۹۱ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے سالانہ محاضراتِ قرآنی کے سلسلہ میں دیئے گئے تھے اور جو، اگر اللہ کے اِذن اور توفیق وتیسیر سے، کتابی صورت میں شائع ہو گئے تو ان شاء اللہ العزیز فکر قرآنی اور حکمت ایمانی کی راہ کا اہم سنگ میل ثابت ہوں گے۔ سردست اس موضوع پر عام قارئین کے اطمینان کے لیے مولانا سید سلیمان ندویؒ کی ایک تحریر بھی شامل ضمیمہ کی جا رہی ہے۔

(ماخوذ از سیرت النبیؐ جلد پنجم)

آخر میں ایک تلخ اور تکلیف دہ حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے۔ مولانا فراہیؒ نے تفسیر سورۃ العصر میں ایک باضابطہ فصل ''لفظ وتواصو سے خلافت کا وجوب'' کے عنوان سے قائم کی تھی، جس کے ذیل میں انہوں نے نہایت صحیح انداز میں اور بڑی عمدگی کے ساتھ ''قیام خلافت'' اور ''اطاعت امیر'' کا وجوب ثابت کیا تھا۔ مولانا فراہیؒ نے اپنی بحث کو جس قول فیصل پر ختم کیا ہے اس کا حوالہ اور اقتباس اگرچہ پیش نظر کتابچے میں موجود ہے، تاہم فوری ملاحظے کے لیے ذیل میں بھی درج کیا جا رہا ہے:

> ''اس سے معاملہ کی اصل حقیقت سامنے آتی ہے کہ مسلمانوں کو اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ عمل صالح کریں، پھر ادائے حقوق کے معاملہ میں ایک دوسرے کی مدد کریں، اور چونکہ ادائے حقوق بغیر خلافت وسیاست کے ناممکن ہے اس لیے ضروری ہے کہ خلافت قائم کریں اور خلافت کا قیام چونکہ اطاعت امیر پر منحصر ہے اس لیے ضروری ہے کہ ان کے اندر اطاعت بھی موجود ہو۔''

مولانا حمید الدین فراہیؒ کے شاگرد رشید مولانا امین احسن اصلاحی اس فکری پس منظر کے ساتھ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کی ''تحریک اسلامی'' میں شامل ہوئے تو اس ''قران السعدین'' سے بہت سا خیر ظہور میں آیا جس کا عظیم ترین مظہر ان کی معرکۃ الآراء تصنیف ''دعوت دین اور اس کا طریق کار'' ہے۔ اس کتاب کا اہم ترین باب ''تبلیغ کس لیے'' ہے، جس کے آخر میں مولانا نے ایک طویل بحث کے لب لباب کو ''خلاصۂ مباحث'' کے عنوان کے تحت ان الفاظ میں درج کیا ہے:

اس پوری تفصیل کا خلاصہ یہ ہے:

ا) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تمام دنیا میں قیامت تک کے لیے تبلیغ دین کی جو ذمہ داری ڈالی گئی تھی اس کی طرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رہنمائی فرما کر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی تکمیل کا کام اپنی اُمت کے سپرد فرمایا، تاکہ یہ امت ہر ملک، ہر قوم اور ہر زبان میں قیامت تک اس دین کی تبلیغ کرتی رہے۔

ب) اس تبلیغ کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ شرط مقرر ہے کہ یہ دل سے کی جائے، زبان سے کی جائے، عمل سے کی جائے، بلاتقسیم وتفریق پورے دین کی کی

جائے، بے خوف لومۃ لائم اور بے رو رعایت کی جائے، اور اگر ضرورت داعی ہو تو جان دے کر کی جائے۔

ج) اس جماعتی فرض کی ادائیگی کا باضابطہ ادارہ خلافت کا ادارہ تھا اور جب تک یہ ادارہ موجود تھا ہر مسلمان اس فرض کی ذمہ داریوں سے سبکدوش تھا۔

د) اس ادارہ کے منتشر ہو جانے کے بعد اس فرض کی ذمہ داری امت کے تمام افراد پر ان کے درجہ اور استعداد کے لحاظ سے تقسیم ہو گئی۔

ھ) اب اس فرض کی مسؤلیت اور ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کے لیے دو ہی راہیں مسلمانوں کے لیے باقی رہ گئی ہیں: یا تو اس ادارہ کو قائم کریں یا کم از کم اس کو قائم کرنے کے لیے سردھڑ کی بازی لگائیں۔

و) اگر مسلمان ان میں سے کوئی بات نہ کریں تو وہ اس فرض رسالت کو ادا نہ کرنے کے مجرم ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے سپرد کیا گیا ہے اور صرف اپنی ہی غلط کاریوں کا وبال اپنے سر نہ لیں گے، بلکہ خلق کی گمراہی کا وبال بھی ان کے سر آئے گا۔

”اس سے معلوم ہوا کہ تبلیغ کے لیے اصل محرک درحقیقت اس فرض عظیم کا احساس ہے جو مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈالا گیا ہے اور اس میں جو چیز بطور مطمح نظر اس وقت پیش نظر رکھنی ہے وہ یہ ہے کہ وہ نظامِ دعوتِ خیر پھر وجود میں آ جائے جو خلق کو اللہ کے دین کی راہ بتا سکے اور دنیا پر اتمام حجت کر سکے۔ جب تک یہ چیز دنیا میں موجود نہیں ہے ہر مسلمان کا سب سے مقدم اور سب سے بڑا اور سب سے اعلیٰ مقصد یہی ہے کہ اس کو وجود میں لانے کے لیے جو کچھ کر سکتا ہے کرے۔ اسی کے لیے ہر مسلمان کو سونا اور جاگنا چاہئے، اسی کے لیے کھانا اور پینا چاہئے اور اسی کے لیے مرنا اور جینا چاہئے۔ اس کے بغیر مسلمانوں کی زندگی خدا کے منشا کے بالکل خلاف ہے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ اپنی اس کوتاہی کے لیے کوئی عذر نہ کر سکیں گے۔ یہ چیز ان کی ہستی کی غایت ہے۔ اگر اس کو انہوں نے کھو دیا تو جس طرح وہ تمام چیزیں جو اپنے مقصد وجود کو کھو کر کوڑے کرکٹ میں شامل ہو جاتی ہیں، اسی طرح یہ بھی اس زمین کے خس و خاشاک سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے اور ان کے لیے یہ ہرگز زیبا نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو ”اُمتِ وسط“ یا ”خیر امت“ کے لقب کا مستحق سمجھیں یا اللہ تعالیٰ سے کسی نصرت و حمایت کی امید رکھیں۔“

لیکن اب سے لگ بھگ ایک برس قبل جب راقم کا قرآن حکیم کا سلسلہ وار درس سورۃ العصر تک پہنچا اور اس موقع پر ”تدبر قرآن“ سے بھی مراجعت کی گئی، تو یہ دیکھ کر نہیں کہا جا سکتا کہ حیرانی زیادہ ہوئی یا افسوس، کہ اگرچہ مولانا اصلاحی نے سورۃ العصر کی تفسیر میں تمام تر انحصار مولانا فراہیؒ کی تحقیق ہی پر کیا ہے، بلکہ تمام اہم مباحث وہیں سے ”نقل“ کیے ہیں (جس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ”تدبر قرآن“ میں تفسیر سورۃ العصر کل ۲۱۰ سطروں پر محیط ہے اور ان سے ۱۴۰ سطریں مولانا فراہیؒ کی تفسیر کے اقتباسات پر مشتمل ہیں) لیکن افسوس صد افسوس کہ تواصی کے لزوم سے قیام خلافت کے وجوب اور اس کے لازمی تقاضے کے طور پر وجوب اطاعت امیر سے متعلق پوری فصل بالکل كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا کے سے انداز میں غائب کر دی گئی ہے۔

نظری طور پر اس کے بہت سے وجوہ و اسباب ممکن ہیں جن میں سے بعض کے ضمن میں سوءِ ظن لازم آتا ہے۔ ان سے قطع نظر کرتے ہوئے اور اس اغماض کو غیر شعوری اور غیر ارادی ماننے کی صورت میں ایک ممکن توجیہ تو یہ ہے کہ اِسے ضعیف العمری اور پیرانہ سالی اور اس سے متعلق اُس اٹل قانون قدرت پر محمول کیا جائے جس کا ذکر ﴿وَمَنْ نُعَمِّرْهُ

نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ﴾ (یٰسین:۶۸) کے الفاظ مبارکہ میں کیا گیا ہے، اور جس کی بنا پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ''ارذل العمر'' سے اللہ کی پناہ طلب فرمایا کرتے تھے۔ ''تدبر قرآن'' میں سورۃ العصر کی تفسیر کی تحریر کے وقت مولانا کی عمر چھہتر برس تھی۔ لیکن راقم کے نزدیک اس کی دوسری زیادہ قرین قیاس توجیہہ یہ ہے کہ سولہ سترہ برس ''تحریک اسلامی'' میں نہایت فعال اور متحرک صورت میں بسر کرنے کے بعد جب مولانا اصلاحیؒ ۱۹۵۸ء میں جماعت اسلامی سے علیحدہ ہوئے[1] تو ایک تو یہی حادثہ ع ''یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے!'' کے مصداق ان میں مایوسی اور دل شکستگی پیدا کرنے کے لیے بہت کافی تھا، پھر اس پر مستزاد یہ کہ جب ۵۸ء سے ۶۲ء تک کے چار سالوں کے دوران میں انہوں نے کسی نئی ہیئت اجتماعیہ کے قیام کے لیے سرتوڑ کوششیں کیں اور ان میں انہیں پے بہ پے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تو اس سے جو شدید مایوسی اور بددلی پیدا ہوئی اس نے ایک جانب ان کے عزم و ہمت اور قوت ارادی کو کچل کر رکھ دیا اور دوسری جانب علامہ اقبال کے ان الہامی الفاظ کے مطابق کہ ع ''نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم عرفاں ہے!'' ان کے قرآنی فکر اور دینی نظریات و تصورات کو زوال و اضمحلال کا شکار اور شکست خوردہ ذہنیت پر مبنی ترقئ معکوس اور رجعت قہقری کا مظہر بنا کر رکھ دیا، فَيَا اَسَفًا وَ وَاحَسْرَتَا.

یہی وجہ ہے کہ خود راقم کی محبوب ترین دعا وہ ہے جو سورۂ آل عمران کی آیت نمبر ۸ میں وارد ہوئی ہے، یعنی ﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ﴾، چنانچہ اس کتابچے کے ہر قاری سے بھی راقم کی استدعا ہے کہ وہ راقم کے حق میں دعا کرے کہ اللہ تعالیٰ اسے زندگی کے آخری لمحے تک اُس صراطِ مستقیم اور سواء السبیل پر بالفعل گامزن رکھے جس کے سنگ ہائے میل اس نے سورۃ العصر میں بیان فرمائے ہیں، اور اس ضمن میں اسے یہ توفیق دیئے رکھے کہ مولانا امین احسن

[1] اس علیحدگی کے وجوہ و اسباب اور اس کے سلسلے کے حوادث و واقعات کی تفصیل کے لیے مطالعہ فرمائیں راقم کی تالیف: ''تاریخ جماعت اسلامی کا ایک گم شدہ باب''

اصلاحی ہی کے ایک قول کے مطابق اگر تیز سواری میسر ہو تو فبہا، اس سے سفر کرے، اگر ایسا نہ ہو اور چھکڑے ہی دستیاب ہوں تو ان کے ذریعے سفر جاری رکھے، یہ بھی نہ ہو تو دو ٹانگوں ہی سے کام لے اور اُس سواء السبیل پر گامزن رہے۔ اور یہ بھی نہ ہو اور کسی داخلی یا خارجی سبب سے ٹانگیں بھی شل ہو جائیں تب بھی ع ''گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے!'' کے مصداق اپنی نگاہوں کو تو منزل پر جمائے رکھے اور کسی حال میں بھی منزلِ مقصود کو نگاہوں سے اوجھل اور سفر کی خواہش کو دل سے محو نہ ہونے دے۔

آخر میں راقم خود بھی نہ صرف اپنے بلکہ اس کتابچے کے جملہ قارئین کے لیے دعا کرتا ہے:

اللھم ربنا اجعلنا بفضلک و کرمک من عبادک
الذین امنوا وعملوا الصلحت وتواصوا بالحق وتواصوا
بالصبر اٰمین یا رب العلمین برحمتک یا ارحم
الراحمین واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین!

خاکسار اسرار احمد عفی عنہ

لاہور۔ ۱۵؍ مئی ۱۹۹۲ء

ایمان اور عمل صالح کے ضمن میں

اس کتاب کی تعبیرات کی تصویب

..................از..................

مولانا محمد طاسین مدظلہ
ناظم ادارۂ مجلس علمی، کراچی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

''راہِ نجات سورۃ العصر کی روشنی میں'' کے عنوان سے محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا کتابچہ بغور پڑھنے کا موقع ملا، جو دراصل موصوف کی ایک اصلاحی تقریر پر مشتمل ہے، جو انہوں نے داعیانہ اسلوب سے کالج کے اساتذہ اور طلبہ کے سامنے ارشاد فرمائی۔ چونکہ اس تقریر کا موضوع قرآنِ مجید کی سورۃ العصر تھا، لہٰذا یہ سورۃ العصر کی تفسیر بن گئی۔ اس کو پڑھنے کے بعد میں اپنے علم وفہم کے مطابق یہی کہہ سکتا ہوں کہ بطورِ تفسیر اس میں جو کچھ فرمایا گیا ہے وہ صحیح و درست ہے، میں نے اس کے اندر کوئی غلط وقابل اعتراض بات نہیں پائی۔ اس میں بندے کی نجات کے لیے ایمان کے ساتھ عمل صالح کی اہمیت پر جو خاص زور دیا گیا ہے وہ خود قرآن حکیم کی سینکڑوں آیات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیسیوں احادیث سے پوری مطابقت رکھتا ہے۔ ایمان کے ساتھ عمل صالح بھی نجات کے لیے ضروری ہے، اس کا اظہار جس طرح قرآن مجید کی ان آیات سے ہوتا ہے جن میں ایمان کے ساتھ ضرور عمل صالح کا ذکر اور دونوں کے مجموعے پر جزاء کا بیان ہے۔ اِس طرح اُن قرآنی آیات سے بھی بخوبی معلوم ہوتا ہے جن میں یہ بیان ہے کہ قیامت کے دن یا آخرت میں جنت اور جہنم والوں سے کہا جائے گا کہ یہ تمہارے اُن اعمال کی جزاء ہے جو تم دنیا میں کرتے رہے تھے، مثلاً یہ آیت: ﴿تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِیْ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَO﴾

اور یہ آیت: ﴿اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَO﴾

اور یہ آیت: ﴿اُولٰٓئِكَ اَصْحَابُ الْجَنَّةِ خَالِدِیْنَ فِیْهَا جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَO﴾

اور یہ آیت: ﴿لِكُلٍّ دَرَجَاتٌ مِّمَّا عَمِلُوْاO﴾

اور یہ آیت: ﴿هَلْ یُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَO﴾

اور یہ آیت: ﴿ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَO﴾

اور یہ آیت: ﴿وَلَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَO﴾

اس قسم کی قرآنی آیات صاف بتلاتی ہیں کہ اُخروی جزاء وسزا کا دارومدار انسان کے اعمال پر ہے۔

میں محترم ڈاکٹر صاحب کی اس بات سے بھی پوری طرح متفق ہوں کہ جب دل میں ایمان اپنی صحیح شکل سے موجود ہو تو انسان سے نیک اعمال ضرور سرزد اور صادر ہوتے ہیں، ان کے درمیان لازم وملزوم کا سا تعلق ہے۔ ایمان کی ماہیت اور فطرت میں صالح اعمال کا تقاضا موجود ہے، گویا ایمان کی خارجی اور معروضی شکل کا نام اعمال صالحہ ہے اور یہ کہ اعمال صالحہ ایمان سے غیر متعلق کوئی الگ چیز نہیں۔

سورۃ العصر کی تفسیر میں ڈاکٹر صاحب نے کہیں یہ نہیں فرمایا کہ عمل صالح کے بغیر ایمان کا کچھ اعتبار اور فائدہ نہیں، یا یہ کہ بدعمل مؤمن یعنی فاسق ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا اور اس کے لیے کبھی نجات نہیں۔ اگر ایسا فرماتے تو ضرور گرفت ہو سکتی تھی، لیکن اُن کی کسی عبارت سے ایسا ظاہر نہیں ہوتا اور اگر کسی عبارت میں دُور کا کچھ احتمال تھا تو وہ اُن کی وضاحت کے بعد ختم ہو گیا، اب اس کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ میں سمجھتا ہوں لزوم اور التزام میں جو فرق ہے اس کو ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے اعتراض کی گنجائش پیدا ہو جاتی ہے۔

حررہ محمد طاسین
مجلس علمی، کراچی

ایمان اور عمل صالح کا باہمی تعلق

مولانا سید سلیمان ندویؒ کی بصیرت افروز تحریر

(ماخوذ از سیرت النبیؐ جلد پنجم)

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس تعلیم کو لے کر آئے، اس کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ انسان کی نجات وفلاح دو چیزوں پر موقوف ہے، ایک ایمان اور دوسری عملِ صالح۔ کتاب سیرۃ النبیؐ کی گذشتہ چوتھی جلد ایمان کی شرح وتوضیح میں تھی، اب یہ پیش نظر حصہ عمل صالح کی تشریح وبیان میں ہے۔ ایمان بنیادی اصولوں پر یقین کامل رکھنے کا نام ہے اور عمل صالح ان اصولوں کے مطابق عمل کا۔ کسی بات کا تنہا علم ویقین کامیابی کے لیے کافی نہیں، جب تک اس علم ویقین کے مطابق عمل بھی نہ ہو۔

اسلام نے انسان کی نجات اور فلاح کو انہی دو چیزوں یعنی ایمان وعمل صالح پر مبنی قرار دیا ہے، لیکن افسوس ہے کہ عوام میں ایمان کو جو اہمیت حاصل ہے وہ عمل صالح کو نہیں، حالانکہ یہ دونوں لازم وملزوم کی حیثیت سے عملاً یکساں اہمیت رکھتے ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ ایمان بنیاد ہے اور عمل صالح اس پر قائم شدہ دیوار یا ستون۔ جس طرح کوئی عمارت بنیاد کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی، اسی طرح وہ دیوار یا ستون کے بغیر کھڑی بھی نہیں ہوسکتی۔

ان دونوں کی بہترین مثال اقلیدس کے اصول اور اشکال کی ہے۔ ایمان کی حیثیت اصولِ موضوعہ اور اصول متعارفہ کی ہے جن کو صحیح مانے بغیر اقلیدس کی شکلوں کا ثبوت محال ہے، لیکن اگر صرف اصول موضوعہ اور اصول متعارفہ کو تسلیم کرلیا جائے اور ان کے مطابق شکلوں کا عمل نہ کیا جائے تو فن تعمیر وہندسہ اور مساحت وپیمائش میں اقلیدس کا فن ایک ذرّہ کارآمد نہیں ہوسکتا، اور نہ اس سے انسان کو وہ فائدے حاصل ہوسکتے ہیں جو اس فن سے اصل مقصود ہیں۔

عوام کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے ضرورت ہے کہ اس بارے میں قرآن پاک کی تعلیم کو تفصیلاً پیش کیا جائے، قرآن پاک نے انسان کی فلاح وکامیابی کے ذریعہ کو بیسیوں آیتوں میں بیان کیا ہے، مگر ہر جگہ بلا استثناء ایمان اور عمل صالح دونوں پر اس کو مبنی قرار دیا ہے اور ہر جگہ ایمان کو پہلی اور عمل صالح کو دوسری مگر ضروری حیثیت دی ہے، فرمایا:

﴿وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ (العصر:۱تا۳)

''زمانہ (مع اپنی پوری انسانی تاریخ کے) گواہ ہے کہ انسان گھاٹے میں ہے، لیکن وہ جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے۔''

زمانہ کی پوری انسانی تاریخ اس حقیقت پر شاہد عادل ہے کہ انہی افراد اور قوموں پر فوز وفلاح اور کامیابی کے دروازے کھلے ہیں، جنہیں ربانی حقائق کا یقین تھا اور اس یقین کے مطابق ان کے عمل بھی نیک ہوتے رہے، ایک دوسری آیت میں فرمایا:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ ۝﴾ (التین:۴تا۶)

''بیشک ہم نے انسان کو بہترین حالتِ درستی میں پیدا کیا۔ پھر اس کو سب سے نیچوں کے نیچے لوٹا دیا۔ لیکن جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے تو ان کے لیے نہ ختم ہونے والی مزدوری ہے۔''

اس آیت میں انسانی فطرت کی بہترین صلاحیت کو پھر خود انسانوں کے ہاتھوں سے اس کی بدترین منزل تک پہنچ جانے کو بیان کیا گیا ہے، لیکن اس بدترین منزل کی پستی سے کون بچائے جاتے ہیں، وہ جن میں ایمان کی رفعت اور عمل صالح کی بلندی ہے۔ یہود سے، جن کو یہ دعویٰ تھا کہ بہشت انہی کے ٹھیکہ میں ہے، یہ فرمایا:

﴿وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ﴾ (البقرہ:۸۲)

''اور جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے وہی جنت والے ہیں۔''

یعنی جنت کا حصول نسل اور قومیت پر موقوف نہیں، بلکہ ایمان اور صالح عمل پر

ہے۔ جو شخص جنت کے لیے یہ قیمت ادا کرے گا وہ اسی کی ملکیت ہے، فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِئُوْنَ وَالنَّصٰرٰى مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝﴾ (المائدہ:۶۹)

”بے شک جو مسلمان ہیں اور جو یہود ہیں اور صابئین اور نصاریٰ، جو کوئی اللہ پر اور پچھلے دن پر ایمان لائے اور اچھے کام کرے، نہ تو ان پر ڈر ہے اور نہ وہ غم کھائیں گے۔“

اس آیت کا منشا بھی یہی ہے کہ فلاح ونجات کا حصول کسی نسل وقومیت پر موقوف نہیں اور نہ کسی مذہب وملت کی طرف رسمی نسبت پر ہے، بلکہ احکام الٰہی پر یقین لانے اور ان کے مطابق عمل کرنے پر ہے۔ عدم ایمان اور بدکاری کا نتیجہ، دُنیا اور آخرت کی تباہی، ایمان اورنکوکاری کا نتیجہ دین ودنیا کی بہتری، اللہ تعالیٰ کا وہ طبعی قانون ہے جس میں نہ کبھی بال برابر فرق ہوا اور نہ ہوگا، چنانچہ ذوالقرنین کی زبانی یہ فرمایا:

﴿قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ۝ وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ ۨالْحُسْنٰى ۚ﴾ (الکہف ۸۷، ۸۸)

”اس نے کہا: جو کوئی گناہ کا کام کرے گا تو ہم اس کو (دنیا میں) سزا دیں گے، پھر وہ اپنے رب کی طرف لوٹا دیا جائے گا تو وہ اس کو بری طرح سزا دے گا۔ اور جو کوئی ایمان لایا اور نیک عمل کیے تو اس کے لیے بدلہ کے طور پر بھلائی ہے۔“

﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ ۚ وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ ۝﴾ (الانبیاء:۹۴)

”تو جو کوئی نیک عمل کرے اور وہ مومن بھی ہو تو اس کی کوشش اکارت نہ ہوگی، اور ہم اس کے (نیک عمل) لکھتے جاتے ہیں۔“

﴿فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ۝ۙ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ شَيْئًا ۝﴾ (مریم:۵۹، ۶۰)

”تو ان کے بعد ان کے ایسے جانشین ہوئے جنہوں نے نماز کو برباد کیا اور نفسانی خواہشوں کی پیروی کی تو وہ گمراہی سے ملیں گے، لیکن جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک کام کیے تو وہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کا ذرا سا حق بھی مارا نہ جائے گا۔“

اس سے اور اسی قسم کی دوسری آیتوں سے یہ بات ثابت ہے کہ جنت کا استحقاق دراصل انہی کو ہے جو ایمان اور پھر ایمان کے مطابق عمل سے بھی آراستہ ہیں، اور جو عمل سے محروم ہیں وہ اس استحقاق سے بھی محروم ہیں، الا یہ کہ اللہ تعالیٰ بخشش فرمائے۔

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ ۚ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۗ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ۝ ذٰلِكَ الَّذِيْ يُبَشِّرُ اللّٰهُ عِبَادَهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ (الشوریٰ ۲۱، ۲۲)

”اور جو ایمان لائے اور نیک کام کیے وہ جنت کے باغوں میں ہوں گے، ان کے لیے ان کے پروردگار کے پاس وہ ہے جو وہ چاہیں، یہی بڑی مہربانی ہے۔ یہی وہ ہے جس کی خوشخبری اللہ اپنے ان بندوں کو دیتا ہے جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے۔“

دوسری جگہ فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ۝﴾ (الکہف:۱۰۷)

”بے شک جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے ان کی مہمانی کے لیے باغِ

فردوس ہیں۔''

پھر آگے چل کر فرمایا:

﴿فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا۝﴾ (الکہف:۱۱۰)

''تو جس کو اپنے پروردگار سے ملنے کی امید ہو تو چاہئے کہ وہ نیک عمل کرے اور کسی کو اپنے پروردگار کا شریک نہ بنائے۔''

ایمان کے ہوتے عمل سے محرومی تو محض فرض ہے، ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ جہاں عمل کی کمی ہے اسی کے بقدر ایمان میں بھی کمزوری ہے۔ کسی چیز پر پورا یقین آ جانے کے بعد اس کے برخلاف عمل کرنا انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ آگ کو جلانے والی آگ یقین کر لینے کے بعد پھر کون اس میں اپنے ہاتھ کو ڈالنے کی جرأت کر سکتا ہے، لیکن نادان بچہ جو ابھی آگ کو جلانے والی آگ نہیں جانتا وہ بارہا اس میں ہاتھ ڈالنے کو آمادہ ہو جاتا ہے، اس لیے عمل کا قصور ہمارے یقین کی کمزوری کا راز فاش کرتا ہے۔

یہی سبب ہے کہ تنہا ایمان یا تنہا عمل کو نہیں، بلکہ ہر جگہ دونوں کو ملا کر نجات کا ذریعہ بتایا ہے:

﴿فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ۝﴾ (الحج:۵۶)

''تو جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے وہ آرام کے باغوں میں ہوں گے۔''

اسی طرح قرآن پاک میں تھوڑے تھوڑے تغیر سے ۴۵ موقعوں پر یہ آیت ہے:

﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ......﴾ (الرعد:۲۹)

''جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کیے۔''

اس سے قطعی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کی نظر میں ایمان اور عمل باہم ایسے لازم وملزوم ہیں، جو ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے اور نجات اور فوز وفلاح کا مدار ان دونوں پر یکساں ہے، البتہ اس قدر فرق ہے کہ رتبہ میں پہلے کو دوسرے پر تقدم حاصل ہے۔

جن مسلمانوں سے اللہ تعالیٰ نے دنیاوی حکومت وسلطنت کا وعدہ فرمایا ہے وہ بھی وہی ہیں جن میں ایمان کے ساتھ عمل صالح بھی ہو:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ﴾ (النور:۵۵)

''تم میں سے ان سے جو ایمان لائے اور نیک کام کیے خدا نے وعدہ کیا کہ ان کو زمین کا مالک بنائے گا۔''

آخرت کی مغفرت اور روزی کا وعدہ بھی انہی سے تھا:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا۝﴾ (الفتح:۲۹)

''اللہ نے اِن میں سے اُن سے جو ایمان لائے اور نیک کام کیے، بخشش اور بڑی مزدوری کا وعدہ کیا۔''

بعض آیتوں میں ایمان کے بجائے اسلام یعنی اطاعت مندی، اور عمل صالح کی جگہ احسان یعنی نیکوکاری کو جگہ دی گئی ہے، مثلاً ایک آیت میں یہود اور نصاریٰ کے اس دعویٰ کی تردید میں کہ بہشت میں صرف وہی جائیں گے، فرمایا:

﴿بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۝﴾ (البقرہ:۱۱۲)

''کیوں نہیں، جس نے اپنے کو اللہ کے تابع کیا اور وہ نیکوکار رہے، تو اس کی مزدوری اس کے پروردگار کے پاس ہے، نہ ڈر ہے ان کو اور نہ غم۔''

ان تمام آیتوں سے یہ اصول ثابت ہوتا ہے کہ نجات کا مدار صرف ایمان پر نہیں، بلکہ ایمان کی ساتھ عمل صالح پر ہے، اور یہی وہ سب سے بڑی صداقت ہے جس سے اسلام سے پیشتر مذاہب میں افراط اور تفریط نمایاں تھی۔ عیسائیوں میں جیسا کہ پال کے خطوط (رومیوں کے نام ۳و۴) میں ہے، صرف ایمان پر نجات کا مدار ہے، اور بودھ دھرم میں

صرف نیکوکاری سے نزوان کا درجہ ملتا ہے اور کہیں صرف گیان اور دھیان کو نجات کا راستہ بتایا گیا ہے، مگر پیغمبر اسلام علیہ السلام کے پیغام نے انسان کی نجات کا ذریعہ ذہنی (ایمان) اور جسمانی (عمل صالح) دونوں اعمال کو ملا کر قرار دیا ہے۔ یعنی پہلی چیز یہ ہے کہ ہم کو اصول کے صحیح ہونے کا یقین ہو، اس کو ایمان کہتے ہیں۔ پھر یہ کہ ان اصولوں کے مطابق ہمارا عمل درست اور صحیح ہو، یہ عمل صالح ہے، اور ہر قسم کی کامیابیوں کا مدار انہی دو باتوں پر ہے۔ کوئی مریض صرف اصولِ طبی کو صحیح ماننے سے بیماریوں سے نجات نہیں پا سکتا جب تک وہ ان اصولوں کے مطابق عمل بھی نہ کرے۔ اسی طرح صرف اصولِ ایمان کو تسلیم کر لینا انسانی فوز وفلاح کے لیے کافی نہیں، جب تک ان اصولوں کے مطابق پورا پورا عمل نہ کیا جائے۔

﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ○ۙ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلٰوتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ○ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ○ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ○...... وَالَّذِيْنَ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ○ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ○﴾
(المؤمنون:۱،۵،۸،۱۰)

''وہ ایمان والے مراد کو پہنچے، جو نماز میں عاجزی کرتے ہیں، اور جو نکمی باتوں کی طرف رخ نہیں کرتے، اور جو زکوٰۃ دیتے ہیں، اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں......' اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس کرتے ہیں، اور جو اپنی نمازوں کے پابند ہیں۔ یہی بہشت کے وارث ہیں۔''

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ہر شے کو ہمارے مادی علل واسباب کے تابع فرمایا ہے، یہاں کی کامیابی اور فوز وفلاح بھی صرف ذہنی عقیدہ اور ایمان سے حاصل نہیں ہوسکتی جب تک اس عقیدہ کے مطابق عمل بھی نہ کیا جائے۔ صرف اس یقین سے کہ روٹی ہماری بھوک کا قطعی علاج ہے ہماری بھوک رفع نہیں ہوسکتی، بلکہ اس کے لیے ہم کو جدوجہد کر کے روٹی حاصل کرنا اور اس کو چبا کر اپنے پیٹ میں نگلنا بھی پڑے گا۔ اس عقیدہ سے کہ ہم کو ہماری ٹانگیں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی ہیں ہم ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ نہیں سکتے، جب تک اس یقین کے ساتھ ہم اپنی ٹانگوں کو بھی خاص طور سے حرکت نہ دیں۔ یہی صورت ہمارے دوسرے دنیاوی اعمال کی ہے۔ اسی طرح اس دنیا میں عمل کے بغیر تنہا ایمان کامیابی کے حصول کے لیے بیکار ہے، البتہ اس قدر صحیح ہے کہ جو ان اصولوں کو صرف صحیح باور کرتا ہے وہ اس سے بہر حال بہتر ہے جو ان کو سرے سے نہیں مانتا، کیونکہ اوّل الذکر کے کبھی نہ کبھی راہِ راست پر آ جانے اور نیک عمل بن جانے کی امید ہو سکتی ہے، اور دوسرے کے لیے تو اوّل پہلی ہی منزل باقی ہے، اس لیے آخرت میں بھی وہ منکر کے مقابلہ میں شاید اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کا زیادہ مستحق قرار پائے کہ کم از کم وہ اس کے فرمان کو صحیح باور تو کرتا تھا۔